غالب
شخصیت و کردار
پروفیسر لطیف اللہ
اِدارۂ یادگارِ غالب

پروفیسر لطیف اُللہ

ادارۂ یادگارِ غالب
کراچی

سلسلہ مطبوعات ادارہ یادگار غالب۔ شمارہ ۲۰

طباعت اول ۱۹۹۸ء

طابع احمد برادرز

تعداد ایک ہزار

قیمت اسی روپے

ادارہ یادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر۔ ۲۲۶۸

غالب لائبریری

دوسری چورنگی۔ ناظم آباد

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

# میرزا اسد اللہ خان غالب

پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء

وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

## مجلس ادارت برائے اشاعت کتب

# فہرست


| | |
|---|---|
| ۱۔ تمہید | ۷ |
| ۲۔ تعلیم و تربیت | ۱۵ |
| ۳۔ صلاحیت کا صحیح استعمال | ۳۲ |
| ۴۔ انفرادیت کا احساس | ۴۱ |
| ۵۔ تقلید محض سے اجتناب | ۵۵ |
| ۶۔ خذ ما صفا ودع ما کدر کا اصول | ۷۱ |
| ۷۔ احباب اور قرابت داروں سے سلوک | ۸۱ |
| ۸۔ انسانی نقطۂ نظر سے مسائل حیات کا مشاہدہ | ۹۲ |
| ۹۔ غالب اور ظرافت | ۱۰۴ |
| ۱۰۔ بازگشت | ۱۱۴ |
| ۱۱۔ کتابیات | ۱۳۳ |

میان مشرب تحقیق و مذہب تقلید
تفاوت دل بیدار و چشم بیدارست
مخور فریب ز صورت نظر بہ معنی کن
کہ ہر چہ نقش دلت نیست نقش دیوارست

(ابوالبرکات منیر لاہوری)

# تمہید

غالب ہمارے ادب کے ان خوش قسمت مشاہیر میں سے ہیں، جن کی شاعری، شخصیت اور ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بایں ہمہ اہلِ علم حضرات کی علمی و ادبی تحقیقات اس باب میں برابر جاری ہیں جس کے نتیجہ میں ہم مرزا غالب کے محاسنِ کلام اور ان کی فنی خوبیوں کے نئے نئے گوشوں سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پسندیدگی اور مقبولیت کے کیا اسباب ہیں؟ کہ نہ صرف ذی علم حضرات بلکہ معمولی اردو جاننے والے بھی میرزا کی شخصیّت اور کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے بے شمار اشعار اور مقطعے زبان میں اس طور پر داخل ہوگئے ہیں کہ وہ زبان ہی کا ایک جز بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

ان اشعار سے ہماری زبان اور کان نا آشنا نہیں ہیں۔ نجی صحبتوں سے لے کر علمی اور ادبی گفتگو تک ہر موقع اور مقام پر یہ اشعار تکرار کے ساتھ سننے میں آتے ہیں اور لذتِ کام و دہن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مرزا ایک بلند پایہ شاعر تھے تو ان کے معاصرین میں اسی قبیل کے اور بھی شاعر اور باکمال حضرات گزرے ہیں لیکن خاص و عام میں ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے جو مرزا غالب کی ذات کو ہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک فنّی اوصاف کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا فن کارانہ حیثیت سے انتہائی بلندیوں پر فائز تھے لیکن یہ خصوصیت بھی عوام میں شہرت و پسندیدگی کے لیے وجہ خاص نہیں بن سکتی، اس لیے کہ لوگ نہ تو فنی باریکیوں میں جانا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اس باب میں ان کی دلچسپی زیادہ عرصے تک برقرار رہ سکتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب وہ انسانی خصوصیات ہیں جن سے ان کی ذات متصف تھی اور یوں کہ ان کی شاعری اور فن میں انسانی شخصیت و کردار کی مختلف اقدار کی نمائندگی پوری طرح موجود ہے۔ لوگ اپنے لیے اس میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے اور یہی سمجھتے ہیں کہ مرزا نے خود ان کے ہی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس حیثیت سے مرزا غالب ایک ایسے شاعر اور فن کار ہیں جن کے کلام میں ایک باشعور اور صحت مند زندگی کی تمام علامتیں پائی جاتی

ہیں اور وہ ادب میں ایک مثالی کردار کی حیثیت سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔
آئندہ صفحات میں ہم مرزا کی شخصیت و کردار کے دو پہلو نمایاں کریں گے
جو فوقِ فطرت عادات اور خوارق میں سے نہیں بلکہ اسی دُنیا کے ایک
صحت مند اور قوی الذہن انسان کی زندگی کے روشن و تابناک پہلو
ہیں اور جو ہر اس شخص کے لیے جو اپنی اور دوسروں کی ذات کے لیے
مستفید بننا چاہے، مشعلِ ہدایت بن سکتے ہیں :

خار ہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منّتے بر قدم راہ رواں است مرا

غور کیجیے یہ حقیقت کس قدر روشن اور واضح ہے کہ آج دنیا میں
جتنے اہلِ کمال "شہرت عام و بقائے دوام" کی نعمت سے سرفراز ہیں، وہی
ہیں جن کی ذات انسانی صفات سے بہرہ مند تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں
نے زندگی کی راہ میں انسانی محبّت کے چراغ روشن کیے ہیں تاکہ
آنے والے اس منزل کا نشان پالیں جس کے لیے وہ مدتِ دراز سے
سرگرم سفر ہیں۔ اس لحاظ سے ان اشخاص کا کلام ان کی سیرت و کردار
کی نمود کے سامنے ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

لیکن تلاشِ حقیقت کی اس دعوتِ فکر کے متضاد اہلِ دنیا نے
جس سطحی انداز کا مظاہرہ کیا ہے وہ بجائے خود ایک المیہ ہے۔ ظاہر بیں
نگاہوں نے کلام کی موسیقیت اور حسن کو تو دیکھا لیکن زندگی کے
ان گونا گوں جلوؤں کی جانب سے آنکھیں پھیر لیں جن کا پرتو ان کے کلام پر پڑا

تھا۔ مجاز سے گزر کر اگر ہم زندگی کی حقیقی رعنائیوں کو دیکھیں تو نظیری کی طرح
کہنا پڑے گا:

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

آج جب کہ ہم اپنی نشاۃ ثانیہ کے عبوری عہد سے گزر رہے ہیں، ضروری
ہوگیا ہے کہ ہم اپنی روایاتِ قومی کا از سرِ نو جائزہ لیں اور جن اربابِ کمال نے
ہمارے تہذیبی ورثہ میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں، ان کی زندگی کے ذکر کو عام
کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ زندہ قومیں اپنے اسلوبِ زندگی سے
جانی پہچانی جاتی ہیں۔ زندگی کا ایک خاص اسلوب حیوانات میں بھی پایا
جاتا ہے لیکن یہ اسلوب طبیعی اور میکانکی ہوتا ہے۔ اس میں ان کے
اختیار اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انسانی اسلوبِ زندگی اختیار
اور ارادے کے باعث وقیع ہے۔ انسانی گروہوں میں طریقِ زندگی روایات
کے احیا و تہذیب ہی سے ترقی کرتا ہے اور کائنات میں اپنے مقام
اور معیار کو منواتا ہے۔

اجتماعی زندگی کے اس مقام کو متعیّن کرانے میں افراد کی کوششوں
کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ افراد سیاسی تاریخ کے خالق ہوتے ہیں،
اور سیاسی تاریخ کے ساتھ خود بھی فنا ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ایسے
بھی ہوتے ہیں جو جریدۂ عالم پر دوامی نقش بن جاتے ہیں۔ آنے والی
نسلیں ان نقوش کو زندگی کے لیے مثالی حیثیت دیتی ہیں اور کارِ حیات کو
آسان بنا لیتی ہیں۔ جارج ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے: "دنیا کی روز
افزوں ترقی اور بہبودی بہت حد تک غیر تاریخی کارناموں پر موقوف ہے۔"

اس خیال کے اظہار سے جالج ایلیٹ کا مقصد یہی تھا کہ ترقی حیات میں تاریخی افراد سے زیادہ ان غیر تاریخی افراد کا حصّہ ہے جنھوں نے انسانی تمدّن کی تہذیب و تنقیب میں اپنے خونِ جگر کو آمیز کیا ہے اور یہی افراد بلند شخصیت اور اعلا کردار کے حامل ہیں۔

زیرِ نظر موضوع پر بحث ختم کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت و کردار کے اصطلاحی مفہوم و معنی کی وضاحت کردی جائے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور نے آکسفورڈ ڈکشنری کے حوالے سے شخصیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"وہ صفت یا صفات کا مجموعہ جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتا ہے مخصوص ذاتی یا انفرادی کردار خصوصاً جب وہ نمایاں قسم کا ہو۔" لہ

کردار کی تعریف مختصر الفاظ میں یوں کی جاسکتی ہے کہ کسی ممتاز شخصیت کا کوئی مخصوص یا نمایاں پہلو کردار کہلاتا ہے۔

اگر ہم لغت کی ان محدود تعریفات کو جو شخصیت و کردار کے لیے کی گئی ہیں، اصطلاحی معنوں میں سمجھنا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شخصیت و کردار ہمارے ان اعمال و افکار کا مجموعہ ہے جو مخصوص معاشرتی حالات، خاندانی ماحول، جسمانی حالت اور واقعاتِ زندگی کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے شخصیت و کردار کے عناصر میں مزاج اور ذہن دونوں شامل ہیں، اور جیساکہ ہم نے اس بحث کے آغاز میں عرض کیا مزاج (طبعی زندگی)

---

لہ شاعری میں شخصیت۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۹ء۔ شمارہ نمبر ا

کے اعتبار سے حیوانات اور انسان کی زندگی میں کوئی حدِّ فاصل نہیں ہے۔ طبعی زندگی کے لحاظ سے دونوں ایک ہی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ البتہ وہ خصوصیت جو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کرتی ہے اور کائنات میں اسے صاحبِ عظمت و فضل بناتی ہے، وہ فکر و تعقّل اور عمل کی قوت ہے۔ اسی قوت سے نظریات و تصوّرات کی دنیا آباد ہوتی ہے اور اسی قوت کی کیفیت و کمیت کی بنیاد پر شخصیت کے درجہ و مقام کا تعین ممکن ہے۔

خوش قسمتی سے ہمیں غالبؔ کے معاشرتی ماحول، خاندانی روایات، جسمانی و دماغی کیفیات اور دیگر شخصی خصوصیات سے متعلق تفصیل سے علم حاصل ہے اس لیے ان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر آسانی سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور ان کے کردار و شخصیت کی "مثالیت" کو متعیّن کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ تصریحات کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ہم اپنے مطالعہ کا آغاز کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل عنوانات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں جن کے اعتبار سے ہمارے نزدیک غالبؔ مثالی شخصیت و کردار کے حامل ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ تعلیم و تربیت
۲۔ صلاحیت کا صحیح استعمال
۳۔ انفرادیت کا احساس
۴۔ تقلیدِ محض سے اجتناب
۵۔ خذ ما صفا ودع ما کدر کا اصول
۶۔ احباب اور قرابت داروں سے خلوص
۷۔ انسانی نقطۂ نظر سے مسائلِ حیات کا مشاہدہ

## ۸۔ غالب اور ظرافت

قدیم اور جدید شعرا کے دائرے میں غالب کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پہلودار ہے کہ زیرِ نظر عنوانات میں اضافے کیے جا سکتے ہیں اور حالی سے لے کر خورشید الاسلام تک ہر مکتبِ فکر کے تنقید نگار نے ان کی شاعری اور فن پر بحث کرتے ہوئے مختلف پہلوؤں پر کہیں کہیں اشارے کیے ہیں اور کہیں تفصیل سے گفتگو کی ہے لیکن عظیم شخصیت کو حصار میں لینا، ہفت خواں کی منزلیں طے کرنے سے کم نہیں عظیم شاعر یا فن کار عظیم انسان بھی ہوتا ہے، اور عظیم انسان الفاظ و بیاں ایک طرف فطرت کی پنہائیوں کے حصار کو بھی توڑ دیتا ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے مطالعہ کے لیے غالب کی شخصیت کے معدودے چند پہلو منتخب کر لیے ہیں اور انھی کو پیش بھی کر رہے ہیں:

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

---

# تعلیم و تربیت

غالب کی ابتدائی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق اب تک جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ میرزا ایک ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کے دادا قوقان بیگ خاں شاہِ عالم کے عہدِ حکومت میں ماوراء النہر سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں کا انتقال اس وقت ہوا جب میرزا کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داری ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اٹھائی۔ میرزا ابھی آٹھ سال کے تھے کہ بدقسمتی سے ان کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد ان کی عمر کا حصہ شادی ہونے تک ننھیال میں گزرا۔ یہ حالات میرزا کے ان خطوط سے لیے گئے ہیں جو انھوں نے منشی حبیب اللہ خاں ذکا اور منشی شیونارائن آرام کے نام تحریر کیے ہیں[1]۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتّب کردہ دیوانِ غالب کے دیباچے میں پنج آہنگ کے حوالے سے ایک فارسی خط نقل کیا ہے جس میں میرزا نے قاضی محمد صادق خاں اختر صاحبِ تذکرۂ آفتابِ عالم تاب کو تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات

---

[1] - اردوئے معلیٰ ایم قربان علی اینڈ سنز ص ۲۲ خطوطِ غالب ص ۲۳۶

تحریر کیے ہیں۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے وقت میرزا کی عمر دس سال تھی۔ تحریر کرتے ہیں :

"چوں پنج سال از عمر من گزشت، پدر از سرم سایہ برگرفت
عمّ من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا باز پرورد،
ناگاہ مرگش فراز آمد کما بیش پنج سال پس از گزشتن برادر
بی ایں برادر برداشت و مرا درین خرابہ جاتنہا گزاشت"۔ [1]

بہر صورت دونوں اندراجات کی رو سے یہی محقّق ہوتا ہے کہ ان سانحوں کے وقت میرزا کی عمر حدِ طفولیت ہی میں تھی۔

مولانا حالی نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مرزا عبد اللہ بیگ خاں بطور خانہ داماد ساری عمر سسرال میں رہے اور میرزا کی پرورش ان کی ننھیال ہی میں ہوئی۔ لیکن میرزا کے اپنے بیانات کی روشنی میں اس مسئلہ پر زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔

میرزا اوائل عمر ہی میں والد اور چچا کی شفقت و پرورش سے محروم ہو گئے تھے۔ با ایں ہمہ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت نہیں برتی گئی اور ان کو زمانے کے رسم و رواج کے مطابق علوم متداولہ کی تعلیم سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا گیا۔ آگرہ میں مولوی محمد معظم نے انھیں پڑھایا لیکن ان کے زمانۂ طالب علمی کا وہ واقعہ جس پر میرزا صاحب ہمیشہ فخر کرتے رہے، یہ تھا کہ ان کو مُلّا عبد الصمد (ہرمزد) ایرانی جیسا صاحبِ زبان استاد میسر آیا جس نے ان کی فارسی زبان دانی کی استعداد میں مزید اضافہ کیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے "غالب نامہ" میں میرزا کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے میرزا کی ملّا

---

[1] دیباچہ عرشی۔ ص ۳

عبد الصمد ایرانی سے گہری عقیدت و ارادت کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے:[1]

"میں نے ایامِ دبستاں نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو لعب اور اس سے آگے فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص ساسانِ پنجم کی نسل میں مع ہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضلِ حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفیِ صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائفِ فارسی بحت اور غوامضِ فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میسّر حالی ہوئے۔

اس مقام پر جناب قاضی عبدالودود صاحب کے ارشادات سے جو انھوں نے اپنے معرکہ آرا مضمون "غالب کا ایک فرضی استاد" مطبوعہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں قلم بند کیے ہیں، استفادہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔

قاضی صاحب موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ ملّا عبد الصمد ایرانی، جسے غالب نے اپنا استاد بیان کیا ہے اور جو اسلام لانے سے قبل ہرمزد کے نام سے موسوم تھا، محض میرزا کے ذہن کی اختراع ہے جو انھوں نے "قاطع برہان" کے نزاع کے سلسلے میں مختلف اعتراضات سے گھبرا کر اور خود کو ایک فاضل استاد سے فیض پایا ہوا ثابت کرنے کے لیے مخترع کی تھی۔ ورنہ عبد الصمد ایرانی کوئی واقعی اور حقیقی شخصیت نہ تھی۔ قاضی صاحب نے اسی مجلّے کے ایک دوسرے مضمون "غالب بہ حیثیت محقق" میں میرزا کی فارسی دانی

[1] غالب نامہ ص ۲۷ از شیخ محمد اکرام۔ یہ خط شمس العلما ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی کے نام ہے۔

اور وسعتِ معلومات پر سختی سے تنقید کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرزا کو زبانِ فارسی کا اتنا وسیع علم نہ تھا جس کا وہ دعوا کرتے تھے اور ان کے بیشتر فیصلے غلط اندازوں پر قائم ہیں یا لاعلمی پر۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں :[۱]

"شاگرد کا استاد کے تلمّذ سے انکار کرنا کوئی نادر الوقوع بات نہیں اور یہ بھی بہت ہوا ہے کہ مصلحتاً خلاف واقع کسی کی شاگردی کا اقرار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کی مثال بہت کم ملے گی کہ کسی شخص نے کسی خیالی ہستی کو جس کی تخلیق کا وہ خود ذمّے دار ہے، اپنا استاد قرار دیا ہو۔ سطور ذیل میں اس سوال سے بحث کی جائے گی کہ عبدالصمد غالب کا زائیدۂ تخیّل ہے یا ایک اصلی شخص جس کے آگے ابتدا ہی میں انھوں نے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔"

موصوف نے اپنی بحث کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے :

"عبدالصمد غالب کا زائیدۂ فکر ہے اور بہت سی باتوں میں غالب کا مماثل ہے تو کچھ باتیں اس میں ایسی بھی پائی جاتی ہیں، جو غالب میں نہیں ملتیں۔"[۲]

"غالب نے عبدالصمد کی مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ اپنی کتابوں کے پڑھنے والوں کو اس کے وجودِ

---

[۱] - علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر، ص ۶۵

[۲] - علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر، ص ۷۶۔

خارجی کا یقین پیدا کرنے کے لیے حکایتیں وضع کیں اور اس
کے حوالے سے بہت سے نکات لکھے۔" ۱؎

ہم اپنی علمی بے بضاعتی اور بے مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے اتنا
ضرور عرض کریں گے کہ میرزا نے اپنی تنقید نگاری اور فنی استعداد کے جو نادر نمونے
یادگار چھوڑے ہیں وہ اس حقیقت کی غمّازی ضرور کرتے ہیں کہ ان گراں مایہ تخلیقات
کا خالق ابتدائے سنِ شعور سے کسی ایسی ہستی کا تربیت یافتہ ہے جس نے اس
کی طبیعت میں زبان و بیان کا بے مثال ذوق پیدا کیا، ایسا ذوق جو اس کے
ذہن کی گہرائیوں میں نغمۂ خاموش اور صدائے بے صوت کی مانند
جاگزین ہے اور جس کے اثر نے اس کے فن اور شخصیت کو ناج محل کی حیثیت
دے دی ہے۔

رہی یہ بات کہ میرزا نے قاطع برہان کے نزاع سے قبل عبدالصمد کے
استاد ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اور اپنے تلامذہ و احباب کو ہمیشہ یہی
کیوں کہتے رہے کہ مجھے مبداءِ فیّاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے۔ اس سے
میرزا کی غرض و غایت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس راہ سے اپنے تلامذہ
کو اس حقیقت سے روشناس کرانا چاہتے ہوں کہ شخصیّت اور کردار کی تشکیل
میں خود انسان کے فکر، عمل اور طلب کو ایک مقام حاصل ہے اور خود اعتمادی،
صلاحیتّوں کی نشو و نما میں سب سے بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ ورنہ ان کے
احباب جن سے وہ بہت زیادہ قریب رہے، اس امر سے آگاہ تھے کہ
میرزا نے عبدالصمد ایرانی سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا ہے اور فارسی زبان کے

---

۱؎۔ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر، ص ۷۶

اسرار و رموز اسی یگانۂ روزگار ہستی سے معلوم کیے ہیں۔ مولانا حالی نے شیفتہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ عبدالصمد نے میرزا کو ایک دوسرے ملک سے خط بھی بھیجا تھا جس کا فقرہ ہے:

"اے عزیز چہ کسی کہ با این ہمہ آزادی ہا گاہ گاہ بہ خاطر می گزری۔"

با ایں ہمہ قاضی صاحب موصوف کو اصرار ہے کہ "عبدالصمد غالب کے ذہن کی ایسی تخلیق ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہ تھا۔

ہمارے نزدیک علم و ادب کی دنیا میں یہ امر محالاتِ عقلی سے ہے کہ کوئی ایسی شخصیّت (بہ استثنائے انبیا علیہم السّلام) جس نے انسانی آبادی کے بہت بڑے حصّے کے ذہن و دماغ کو متاثّر کیا ہو کسی "مردِ کامل" کے استفادے سے بے بہرہ رہی ہو۔ فلاسفہ میں سقراط سے بوعلی سینا، تمثیل میں ہومر سے شاتک اور شعر و ادب میں جلال الدّین رومی سے اقبال تک کوئی ایسی شخصیّت نہیں گزری جس نے کسی نہ کسی عظیم شخصیت سے اپنی زندگی میں استفادہ نہ کیا ہو۔ پھر غالب کے باب میں کسی استاد کے فرضی یا غیر فرضی ہونے کا کیا سوال ہے؟

ہیچ چیز از خود بخود چیزے نہ شد
ہیچ آہن خنجرے تیزے نہ شد
مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزے نہ شد

ان وجوہات کی بنا پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ میرزا کی فارسی زبان تعلیم و تدریس میں ضرور کسی صاحبِ کمال کا حصّہ ہے اور جو خود ان کے قول کے

مطابق ہرمزد ایرانی ثم عبدالصمد ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف اگر میرزا ساری عمر نہ بھی کرتے تب بھی عقلِ عام یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ انھیں مزاجِ زبان سے آگہی اور بصیرت کے باب میں کسی متبحر عالمِ لسانیات کی رہ نمائی کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اس بحث سے زیرِ غور مسئلے کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اگر قاضی صاحب موصوف کے ان دلائل کو جن کی بنیاد پر عبدالصمد ایرانی کا فرضی وجود ہونا ثابت کیا گیا ہے، صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پہلی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ میرزا نے زبانِ فارسی میں جو قابلِ رشک بصیرت اور استعداد پیدا کی، وہ ذاتی مطالعے کے باعث ہے۔ نیز فارسی لسانیات کے علم میں وہ کسی استاد کی تعلیم کے مرہونِ منّت نہیں ہیں تو اس صورت میں ان کی شخصیت ہماری نگاہوں میں اور بلند ہو جاتی ہے اور اس پر مزید تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دوسری صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ میرزا نے فارسی زبان دانی کا جو دعوا کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ نیز وہ فارسی لسانیات کے اصول و مبادیات سے بہت کم واقف تھے لیکن جس شخص نے میرزا کی فارسی نثر و نظم کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ میرزا کو فارسی زبان و ادب پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اور انھوں نے جو علمی و ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ نہ صرف بہ اعتبارِ زبان بلکہ بہ اعتبارِ فن بھی اس قابل ہے کہ اسے اہلِ زبان کے سامنے پیش کیا جائے اور اس جگر کاوی و سخت کوشی کی داد طلب کی جائے جس کی حسرتیں لیے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

چناں چہ ایک فارسی شعر میں کس حسرت سے کہتے ہیں:

بیا درید گر ایں جا بود سخندانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد[1]

بظاہر یہ بحث کہ عبدالصمد غالب کا فرضی استاد ہے یا حقیقی، ہمارے بنیادی موضوع سے غیر متعلق سا ہے لیکن میرزا کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں اس سے قطع نظر کرنا میرزا کی زندگی کے ایک اہم گوشے سے چشم پوشی کے مترادف تھا۔ اس لیے اپنی آگہی اور دانست کے مطابق ہم نے مذکورہ گزارشات کو اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔[2]

میرزا کے تعلیمی معیار اور اس کے زیرِ اثر ذہنی ارتقا کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے نظامِ تعلیم و نصابِ تعلیم کی جو اس وقت مسلمانوں میں رائج تھا، وضاحت کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کا نظامِ تعلیم جب کہ مسلمان سیاسی انحطاط سے دوچار تھے موجودہ زمانے سے مختلف تھا اور اس سلسلہ میں جو کچھ اصلاحات کی گئیں اس کا صحیح اندازہ سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقائے کار

---

[1] - غالب کی فارسی دانی پر قاضی صاحب موصوف کے اعتراضات کے جوابات ڈاکٹر شوکت سبزواری کی گراں قدر تصنیف "غالب فکر و فن" میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] - مذکورالصدر گزارشات تحریر کرنے کے ایک عرصے بعد ہمیں سفرِ لاہور کے دوران یونی ورسٹی لائبریری میں جناب مالک رام صاحب ایم۔اے کے مضمون "مُلا عبدالصمد (استادِ غالب)" (مطبوعہ نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۵۲ء) سے استفادہ کا موقع ملا۔ موصوف نے

کی پُرخلوص کوششوں اور مخالف تحریک کے واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔
سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انیسویں صدی میں اس

---

(بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب کے تمام اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے صراحت کی ہے کہ بلاشبہ غالب نے شعر و سخن میں کسی شخص سے تلمذ حاصل نہ کیا تھا اور اس لحاظ سے سوائے مبدائے فیاض کے وہ کسی استادِ سخن کے مرہونِ منت نہ تھے۔ لیکن اس حقیقت سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ فارسی زبان کی تعلیم کے سلسلے میں بھی انھوں نے کسی استاد سے اخذِ فیض نہیں کیا۔ قاضی صاحب کے اعتراضات غالباً شعر و سخن کی تعلیم اور زبان کی تعلیم میں کما حقہٗ، فرق نہ کرنے پر مبنی ہیں۔

اپنے مضمون کے آخر میں مالک رام صاحب نے جو مثبت دلیل مُلّا عبدالصمد کے استادِ غالب ہونے پر پیش کی ہے ہم اس کا اعادہ کرتے ہیں۔

"یہاں تک میں نے ان دلائل پر جرح کی ہے جو جناب قاضی صاحب نے ملا عبدالصمد کو فرضی وجود ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہیں، یہ منفیانہ پہلو ہے۔ یعنی میری نظر میں ان کی کوئی دلیل بھی مُسکت نہیں اور ان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مُلا عبدالصمد کوئی آدمی نہیں تھا۔ اب میں ایک ایسی دلیل دینا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک مثبت حکم رکھتی ہے، اور جس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے۔"

مولانا حالی لکھتے ہیں:

برِ صغیر سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تیزی سے ختم ہو رہا تھا، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی و معاشرتی اجتماعیت کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہ تھا۔ شہنشاہِ دہلی کی حکومت برائے نام قلعہ معلّیٰ تک محدود تھی۔ لکھنؤ میں نوابین اودھ کا یہی حال تھا۔ نیز دیگر ریاستوں کے

---

(بقیہ حاشیہ) "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کہتے تھے کہ ملا عبد الصمد کے ایک خط میں جو اس نے میرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، یہ فقرہ لکھا تھا: "اے عزیز چہ کسی کہ با ایں ہمہ آزادی ہا گاہ گاہ بخاطر می گزری۔"

اس پر جناب قاضی صاحب موصوف نے یہ تبصرہ فرمایا ہے:

"انھوں نے (یعنی مولانا حالیؔ نے) اس پر غور نہیں کیا کہ شیفتہ (خط کو) خود دیکھنے کا دعوا نہیں کرتے اور اس پر توجہ نہ کی کہ گلشنِ بے خار میں شیفتہ نے عبد الصمد کا ذکر نہیں کیا۔"

گلشنِ بے خار میں عبد الصمد کا ذکر نہ ہونے سے متعلق تو میں لکھ چکا ہوں کہ میرزا نے عبد الصمد سے اپنے کلام پر اصلاح نہیں لی تھی کہ وہ ان کا ذکر کرتے۔ اور اگر اس پر اصرار ہی کیا جائے تو انھوں نے مولوی محمد معظّم کا ذکر بھی نہیں کیا۔

لیکن حیرت ان کے اس فقرے پر ہوتی ہے: "شیفتہ خود دیکھنے کا دعوا نہیں کرتے۔" کیا دعوا کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ مولانا حالیؔ کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

(۱) مولانا حالیؔ سے یہ روایت خود نواب شیفتہ مرحوم نے بیان کی تھی۔

(۲) نواب شیفتہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ملا عبد الصمد کے ایک خط میں یہ فقرہ لکھا تھا جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خط انھوں نے دیکھا تھا۔

مسلمان فرماں روا غیر ملکی اثر و اقتدار کو عملی طور پر قبول کر چکے تھے۔ ان حالات میں تعلیمی نظام اپنی اجتماعی صورت میں کیسے برقرار رہ سکتا تھا۔ سوا اس کے کہ جو خاندان اپنے بچوں کا تعلیمی بار اٹھا سکتے تھے وہ ان کو انفرادی طور پہ تعلیم دلاتے تھے۔ میرزا نے اس حالت میں جب کہ ان کے والد اور چچا کا انتقال ہو گیا تھا اور کوئی آبائی سرپرست ان کی نگرانی نہ کر سکتا تھا جن دشواریوں کے ساتھ تعلیم حاصل کی ہو گی ان کا بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ نظامِ تعلیم کی اس خرابی کے باوجود انیسویں صدی میں جو نصابِ تعلیم رائج

---

(بقیہ حاشیہ) (۳) نواب شیفتہ کا اس خط کے ایک فقرے کو پورا کا پورا اصلی لفظوں میں روایت کر دینا دوسرا ثبوت ہے اس بات کا کہ انھوں نے یہ خط خود دیکھا تھا۔

(۴) خط کا وجود اس کے لکھنے والے کے وجود پہ دال ہے اور ثبوت ہے ملا عبد الصمد کے تاریخی شخصیت ہونے کا۔

اور سچ پوچھیے تو میری نظر میں تو خود یہ فقرہ بھی ملا عبد الصمد کے وجود کی دلیل ہے۔ اسے ملا ہی کی طرح کا کوئی بے ہمہ و باہمہ شخص لکھ سکتا ہے اور کم از کم میرے نزدیک وہ کچھ اسی قسم کے انسان تھے۔ واللہ اعلم۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا حالی دونوں ثقہ اور معتبر راوی ہیں۔ ہم وہم بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی نے غلط بیانی کی ہو گی یا واقعے کے بیان میں "زیبِ داستان" کے لیے کسی طرح کے حذف و اضافہ سے کام لیا ہو گا۔ اگر ہم ایسی صریح اور بیّن شہادت پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے تو تاریخ اور مذہب کی کسی روایت کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

تھا اس کے ٹھوس ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نصاب میں فلسفہ، تاریخ، منطق، ریاضی، اصول، طب، نجوم، فقہ اور حدیث، سبھی علوم شامل تھے۔ یہ وہ علوم تھے جن کو مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ترقی دے کر سائنٹفک صورت بخشی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مشاہیر نے جو علمی کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کا عشرِ عشیر بھی ہم اپنے زمانے میں نہیں پاتے۔ اگرچہ ہمارا دعوا ہے کہ ہمارا دَورِ علم و ادب میں گزشتہ دَور سے بہتر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گزشتہ دور کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ طالب علم میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرتا تھا جو ہمارے دور میں نسبتاً کم ہے۔ اس موقع پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر ماضی میں کچھ علمی کارنامے ہوئے ہیں تو ان کی افادیت اس وقت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں گزشتہ دور کے معاشی و معاشرتی حالات اور سماجی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا اور اگر ہم صحیح طور پر قیاس کر سکتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ قدیم دور کا نصابِ تعلیم جو نجی اور اجتماعی درس گاہوں میں رائج تھا، اپنے زمانے کے معاشرتی و تہذیبی حالات کے عین مطابق تھا۔ اور جہاں تک افادی پہلو کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ قدیم دور کے بیشتر تحقیق شدہ مسلّمات اب بھی اسی طرح برقرار ہیں جس طرح اس زمانے میں تھے۔ اس سے زیادہ ان علوم کی افادی حیثیت اور کیا ہو سکتی تھی کہ موجودہ نسل ان سے اسی طرح فائدہ اٹھا رہی ہے جس طرح گزشتہ نسل اٹھاتی تھی۔

میرزا غالب نے بھی عام طلبا کے مانند جیسا کہ ان کے خطوط اور دیگر تصانیف سے ظاہر ہے متداولہ علوم کی معمولی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اس کا جو کچھ بھی معیار ہوگا اس کا اندازہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس

معمولی تعلیم کی بنیاد پر اپنے ذاتی مطالعے کی قوت سے جو ادبی قصر الفنون نے تعمیر کیا اس کی رفعتوں کا اندازہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہی رفعت ہمارے ادب کے ارتقا میں روح کی مانند رواں دواں رہی ہے :

ہاں ہم دم فرزانہ دانی رہِ دیرانہ
شمعے کہ نہ خواہد شد از باد خموش آور

میرزا کی شخصیت کے اس پہلو کو جانچنے کے لیے ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی ہوگی ۔ وہ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد اور چچا کا انتقال ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال میرزا کے لیے انتہائی صبر آزما ہوگی ۔ اگرچہ ان کے ننھیال والوں نے ان کی اور بھائی بہنوں کی پرورش اپنے ذمّے لے لی اور کسی طرح ان کی آبائی پنشن کا بندوبست بھی ہوگیا لیکن اس کم عمری میں ان کے لیے یتیم و یسیر ہونے کا احساس ناگزیر تھا۔ اس احساس کے دو ہی ردِ عمل ہو سکتے تھے ۔ ایک تو یہ کہ میرزا پر ایک ہی طرح کی بے سر و سامانی کا احساس ہمیشہ طاری رہتا اور اس کی انتہا یہ ہوتی کہ وہ شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ۔ اس خطرناک صورتِ حال کا جو نتیجہ ہوتا ، نفسیات کے عالم اس سے بخوبی واقف ہیں ۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اپج اور ذہنی ارتقا کے مدارج جو ان کی زندگی میں قطعی واضح اور روشن ہیں ، ان کی نمو ذرا کہیں نہ ہوتی ۔ دوسرا ردِ عمل یہ کہ وہ اپنی بے چارگی کا پورے سکون سے جائزہ لیتے اور اس خلا کو پُر کرتے جس سے ان کی زندگی میں ناہمواری پیدا ہو سکتی تھی ۔ میرزا نے اس دوسرے ردِ عمل کو قبول کیا اور اس کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ اتنی کم عمری کے باوجود کچھ بننے اور کچھ کر دکھانے کی خواہش نے ان کے شعور کو باطل تخیلات کی آماج گاہ

نہ ہونے دیا :

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

میرزا صاحب کی شخصیت و کردار کے بعض مضمرات کو واضح کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب نے اپنی قابلِ قدر تصنیف "غالب" میں جو متوازن بحث کی ہے اس موقع پر اسے پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں :

"غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی ، وہ دلّی اور آگرے کے چند معزز خاندانوں میں سے تھا ۔ یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلے میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں ، منصب داروں اور ان کی سازشوں ، مرہٹوں ، روہیلوں ، نوابین اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا ۔ اس کے اغراض بھی مختلف موقعوں پر ان ہی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہے ۔"[1]

ڈاکٹر صاحب اس بحث کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"غالب نے اپنے خاندانی ماحول سے باہر بچپن اور لڑکپن میں بس یہی فضا دیکھی تھی ۔ آخر یہ سب کچھ اس طرح کیوں ہے ؟ یہ سوال بار بار ان کے دماغ میں ہوتا ہے اور ان کے کلام سے ظاہر ہے لیکن انھیں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا

---

[1] ۔ "غالب" از خورشید الاسلام ۔ ص ۱۹

اور ان کا بے پناہ سوچنے والا دماغ سخت الجھن میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ اک عمر کے بعد وہ اس پیچیدگی سے باہر نکل آتے ہیں۔"[۱]

اس بحث سے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کو مدِّنظر رکھتے ہوئے آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میرزا کی زندگی اور ان کی انفرادی طبع کا خمیر اسی دور کے اہم واقعات وحالات سے پیدا ہوا۔ عیش وتنعم کے خاتمہ کے بعد اس کی بازیابی کے لیے جدّوجہد حسرت وناکامی کے باوصف استقلالِ طبع کا اظہار اور مصائب وآلام کے ہجوم میں ہشاش وبشاش رہنے کا سلیقہ اسی زمانے کے اثرات ہیں جن پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے اور اپنے احباب اور شاگردوں کو نفسِ مطمئنہ کی حکایتیں سناتے رہے:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

○

نفسِ قیس کہ ہے چشم وچراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

○

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں ہیں نالہ زبونیِ کشِ تاثیر نہیں

○

---

۱۔ "غالب" از خورشید الاسلام۔ ص ۱۴۲

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

○

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہیں تو دے نہیں ہے

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

○

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

○

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

○

ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں :

"مجھ کو دیکھو، نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں۔ باتیں روز کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ شکر ہے نہ شکایت، جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت"

زندگی کے بارے میں غالب کا اندازِ نظر ان کی سلامت روی اور رجائیت پسند طبیعت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے جس کی داغ بیل ان کی تعلیم و تربیت کے زمانے ہی میں پڑ چکی تھی۔ اس لحاظ سے ان کے کردار کا یہ پہلو بھی ان کو اپنے عہد کی عام شخصیتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

---

# صلاحیت کا صحیح استعمال

غالب کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا اور اپنی عسکری قابلیت و استعداد کی بدولت انھوں نے امرائے سلطنت میں اپنی جگہ حاصل کی تھی۔ زمانے کے رسم و رواج کے مطابق میرزا کو بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں عسکری زندگی اختیار کرنا چاہیے تھی لیکن انھیں اپنی استعداد اور صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ تھا اور وہ یہ جان چکے تھے کہ عسکری زندگی اختیار کر کے وہ اپنے آبا و اجداد کی مانند ترقی اور شہرت حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے لیے دوسرا میدان جو ان کی امنگوں اور آرزوؤں کا ماویٰ و ملجا تھا، منتخب کر لیا اور اس طرح اپنی تمام ذہنی قوتوں اور فکری صلاحیتوں کو شعر و سخن کے لیے مخصوص کر دیا۔ چناں چہ تحریر کرتے ہیں:

"آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ اختر آفریدند۔ نہ بآئینِ نیاگانِ خویش سلطانِ سنجر دارائے کلاہ و کمرے و نہ بفرہنگِ فرزانگانِ پیشیں بوعلی آسا علم و ہنرے، گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بود، راہزنی کرد و مرا بداں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سرِ لشکری و دانش وری خوب نیست۔ صوفی گری بگزار و بہ سخن گستری روئے آر۔ ناگزیر ہم چناں

کردم و سفینہ در بحرِ شعر رواں کردم۔ قلم علم شد و نیرہائے شکستہ آبا قلم"۔ [1]

اس انکشاف سے واضح ہو جاتا ہے کہ میرزا نے شعوری طور پر جادہ پیمائی سخن کو تمام مشاغل پر ترجیح دی۔ یہ فیصلہ انتہائی دانش مندی پر مبنی تھا اور آنے والے دور نے ثابت کر دیا کہ انھوں نے ترقی و عروج کے بامِ بلند تک پہنچنے کے لیے جو راہ اختیار کی تھی وہ کس قدر صحیح تھی۔ اقلیمِ سخن میں ان کی فرماں روائی کوئی باطل مفروضہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اردو ادب پر میرزا کے جو احسانات ہیں، ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ظاہر ہوگا جب ہم اپنی زبان کے شاعروں اور ادیبوں کے ذہنی ارتقا اور فنی کمالات کی جامع تاریخ مدوّن کریں گے۔ اس وقت یہ حقیقت قطعی واضح ہو جائے گی کہ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر و فن کار تھے بلکہ مثالی انسان بھی تھے جنھوں نے شاعر و فن کار کی حیثیت سے بھی اپنے نقوش "جریدۂ عالم" پر ثبت کیے ہیں اور انسان کی حیثیت سے بھی :

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

میرزا کے خطوط میں بھی ان کی صلاحیت اور ادبی استعداد کے بارے میں جستہ جستہ اشارات ملتے ہیں۔ مولوی عبدالغفور نسّاخ کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں :

"خاکسار نے ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی

---

[1] "غالب نامہ" از شیخ محمد اکرام : ص ۲۰۴

کی ہے۔ پھر وسطِ عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت لکھا " [۱]

اسی خط میں تحریر کرتے ہیں :

" ایک کم ستر برس دنیا میں رہا اب اور کہاں تک رہوں گا۔ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت، تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے، اب اور کیا کہوں گا "

ایک خط میں منشی سید محمد عباس صاحب کو لکھتے ہیں [۲] :

" کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ طرزِ عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی، گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔ مبداء فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ "

ایک اردو شعر میں کسی قدر واضح الفاظ میں کہتے ہیں :

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

---

[۱] ، [۲]۔ خطوطِ غالب از مولانا مہر۔ ص ۵۸۲ ، ۵۸۱

میرزا نے اپنی صلاحیّت و استعداد کے بارے میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ میرزا کے اس دعوے میں کتنی سچائی اور حقیقت موجود ہے اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ افراد اپنی خوبیوں کا صحیح استعمال نہ کرنے سے ان درجات تک نہیں پہنچتے جو اُن کی دسترس میں ہوتے ہیں :

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

میرزا نے اپنی فطری صلاحیّتوں سے جو مقام ہمارے ادب میں حاصل کیا ہے، اس موقع پر اس کا اجمالی تبصرہ بے محل نہ ہوگا۔ اگرچہ میرزا نے اوائل عمر ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ورودِ دہلی سے ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ دہلی اپنی تمام ویرانیوں اور زبوں حالیوں کے باوجود مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن جیسے اہلِ کمال حضرات سے معمور تھی۔ میرزا نے ان اہلِ کمال میں کافی وقت گزارا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میرزا کی صلاحیّت و استعداد میں مزید ترقی و ہمواری پیدا کرنے میں ان حضرات کا بڑا حصّہ تھا جن کی محبّت، خلوص اور درست مشوروں کا اعتراف انھوں نے اکثر مقامات پر کیا ہے۔ یہ بات کہ ان حضرات کی علمی و ادبی صحبتیں میرزا کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئیں، نہ تو میرزا کے لیے کسرِ شان سمجھنا چاہیے اور نہ ان کے عظیم مرتبہ میں اس سے فرق آسکتا ہے۔ کسی دور میں چند اہلِ کمال کا ہم صحبت و ہم جلسہ ہونا اتحادِ خیال و یک رنگیِ ذوق کے سبب ہوتا ہے۔ ان مجالس میں وہ ایک دوسرے

سے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور مستفید بھی ۔ دورِ شاہجہانی میں کلیمؔ ہمدانی کی رخصتِ کشمیر کا پسِ منظر اس کے سوا کیا ہے کہ وہاں اس کو غنیؔ اور سلیمؔ کی صحبتیں جو اس کے ہم مذاق و ہم مشرب تھے، میسّر آسکتی تھیں ۔ ورنہ جہاں تک میرزا کی ذاتی صلاحیت اور شعری استعداد کا تعلّق ہے، اس کے بارے میں یہ حضرات جو رائے رکھتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے کیا جاسکتا ہے جو مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالب میں نقل کیا ہے :

"مولانا (فضلِ حق خیرآبادی) کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی میرزا صاحب سے جاکر پوچھے ۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کیے ۔ اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا : "آپ میرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے ۔" اور پھر وہ شعر پڑھا اور میرزا نے جو کچھ اس کے معنی کہے تھے، بیان کیے ۔ مولانا نے فرمایا : "پھر ان معنوں میں بُرائی کیا ہے ؟" اس نے کہا : "بُرائی تو کچھ نہیں مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے ۔" مولانا نے کہا : "اگر ناصر علی نے وہ معنے مراد نہیں لیے جو میرزا نے سمجھے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی ۔" [1]

یادگار میں حالیؔ نے ایک دوسرے واقعے کا بھی ذکر کیا ہے جس سے غالب کے بارے میں شیفتہ کی رائے سے بھی آگاہی ہوتی ہے شیفتہ کہتے ہیں :

---

[1] "یادگارِ غالب" ، شائع کردہ ایم قربان علی ۔ ص ۲۰۶

"میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا، اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت میرزا صاحب بھی آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا صاحب کو دکھایا انھوں نے کسی قدر غور کرنے کے بعد اس کا مطلب اس خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے" [1]

ان اہلِ کمال کے نزدیک میرزا کی یہ قدر و منزلت کسی سطحی خیال کے تحت نہ تھی بلکہ انھوں نے اپنے احباب پر خود کو اس رتبہ کے اہل ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اعلیٰ درجے کے سخن فہم ہیں بلکہ نظم و نثر کے فن میں ایک نئے دَور کے نقیب و علم بردار بھی ہیں، ایک فارسی شعر میں اپنے متعلق پیش گوئی کرتے ہیں:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

آج اگر ہم میرزا کی اس پیش گوئی کو گزشتہ و موجودہ صدی کے ادبی رجحانات کے آئینے میں دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اردو نظم و نثر کے مختلف اصناف کا ارتقا ان ہی بنیادوں پر ہوا ہے جن کی داغ بیل میرزا نے رکھی تھی۔ اردو خطوط نگاری ہی لیجیے۔ مولانا شبلی سے لے کر نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالکلام آزاد تک جن اہلِ قلم نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ سب ان ہی کے اسلوبِ نگارش کی تقلید میں ہے۔ لیکن وہ ندرت، سادگی اور بے ساختہ پن جو میرزا کے خطوط کی امتیازی

[1] غالب ۔ از خورشید الاسلام ص ۲۸

خصوصیات ہیں ان میں سے کسی اہلِ قلم میں نہیں پائی جاتی، اگرچہ اپنی اپنی انفرادیت کی جھلک ان کے خطوط میں موجود ہے۔ علاوہ اس کے اگر گزشتہ ایک صدی کے نثری ارتقا کا مجموعی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اُس کا ماحصل یہ ہے کہ جن حضرات نے اردو نثر کی ترقی میں حصّہ لیا ہے وہ میرزا کی نثر نگاری سے ذہنی و جدانی طور پر بے حد متاثر تھے۔ مولانا حالی، سر سیّد احمد خاں، شبلی، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری نے جو اردو نثر نگاری میں صاحبِ طرز و ادا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ میرزا کی نثر سے جو استفادہ کیا ہے وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ یوں اگر کوئی واضح طور پر اعتراف نہ کرے تو اور بات ہے لیکن ان کی تحریریں بذاتِ خود انھیں اصولوں کی نشان دہی کرتی ہیں جنھیں میرزا نے پہلے پہل اپنی نثر میں اختیار کیا تھا۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ میرزا نئے دَور کی شاعری کے پیش رو تھے اور پیش رَو ہی رہیں گے۔ خواہ اس دور میں حالی پیدا ہوں یا اقبال، ان کی شعری عظمت اسی طرح برقرار رہے گی جس طرح میرزا کے اپنے عہد میں قائم تھی، کہتے ہیں :

ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

میرزا کی شخصیّت و کردار کا ایک ضمنی پہلو اُن کا ادبی و فنی شعور ہے جو انھیں نہ صرف اپنے عہد کے شعرا سے بلکہ عہدِ مغلیہ کے تمام فارسی شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے فارسی قصیدے، غزلیں، مثنویاں جہاں ان کی ندرتِ خیال، اسلوب کی دل کشی اور مضمون آفرینی کی نشان دہی کرتی ہیں، وہیں ان کے ادبی و فنی شعور کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ انھوں نے

قصیدوں اور غزلوں سے ایک چابک دست فن کار کے مانند بڑے بڑے کام لیے ہیں۔ اور ہماری شاعری کو نئے نئے تجربوں سے مایہ دار بنایا ہے۔ غزل کو قصیدے کا روپ دینا اور قصیدے کو غزل کا لباس دینا ان ہی کی ایجاد ہے اور یہ فن انھی پر ختم بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشتِ فن کو سدا بہار بنانے کے لیے فن کار کو ایسے سرچشمے تلاش کرنا پڑتے ہیں جو ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں جن کی روانی و مست خرامی زمانے کے تغیرات و انقلابات سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہ کبھی خشک نہ ہونے والے سرچشمے زندگی کی توانائیوں سے نکلتے ہیں اور عظیم فن کار ان ہی سرچشموں سے فن کی آبیاری کرتا ہے اور اپنے فن کو زندگی کی مانند جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں بناتا ہے۔ غالب نے اپنے فن کو زندگی کی اعلا قدروں سے ہم آہنگ بنایا اور اپنی صلاحیتوں کی قوت سے اس مقام تک پہنچے جہاں اکثر فن کار پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتے ہیں:

لوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است

بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

غالب کی ابتدائی زندگی جن نامساعد حالات سے دوچار رہی اور جن مشکل مراحل سے گزر کر وہ عظیم فن کاروں کی بارگاہ میں پہنچے۔ شعر و ادب کے مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

"کیست تا از من بہ سدرہ اگر ناپرسیدہ گویم دردلش فرد آید

کہ درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روے دادہ۔ [1]

---

[1] بحوالہ حکیم فرزانہ از شیخ محمد اکرام ص ۵۲

انھوں نے جو محنت و مشقّت اس باب میں برداشت کی اس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح باخبر تھے اور اس کے استعمال کرنے میں بھی کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوئے :

خونِ جگر سے ہے رگِ ہر خارِ شاخِ گل
تاچند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

---

# انفرادیت کا احساس

کسی صاحبِ حال بزرگ کا شعر ہے :

سراپا در سراپا ئے خودم از بے خودی قرباں
بگردِ مرکزِ خود صورتِ پرکار می رقصم

حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی ذات احساسِ انا اور ذوقِ خودی کے ارتقائی مدارج سے گزرتی ہے تو کائناتِ عالم میں اسے اپنی ذات سے زیادہ دل کش و جاذب توجّہ کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ یہ صفات جسے اقبال نے "خودگری و خودنگری" سے تعبیر کیا ہے، شخصیت و کردار کی تکمیل میں سب سے زیادہ قوی عناصر ہیں، اور جب حیات ان قوتوں پر متصرف ہو جاتی ہے تو کائنات کا تمام حسن اور اس کی رنگینیاں اس کے پیکر میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب حیات خود اپنے پیکر میں انوارِ تجلّیات دیکھتی ہے اور خود اس کا طواف کرتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ درجہ بدرجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتدائی کیفیات مقامِ منتہا کی لذّتوں سے مختلف تو نہیں ہوتیں لیکن ان کی کمیت میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے اس ارتقائی حقیقت کو بڑے لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے :

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

بہر نوع شخصیّت کی تکمیل میں نشو و نمائے ذات کا احساس جزوِ لاینفک ہے اور یہ احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب فرد شک کی جگہ یقین اور تذبذب کے بدلے اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وہ "یدِ بیضائے کلیمی" ہے جس کے سامنے بے یقینی کے عفریت اور ظن و تخمین کے طاغوت عاجز و درماندہ ہو جاتے ہیں اور انسان تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر شخصیّت کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ آپ دُنیا کے عظیم انسانوں کے حالات و سوانح کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کو جس جذبے نے اپنے زمانے کے افراد سے بلند کیا ہے وہ انفرادیت کا احساس ہی تھا۔ اور اس احساس کو برقرار رکھنے کے لیے جو عوامل کام کر رہے تھے وہ یقین و اعتماد ہی سے پیدا ہوئے تھے۔

اس اعتبار سے غالب کی شخصیت کا مطالعہ دل چسپ اور مسرّت انگیز ہے۔ اس مطالعہ سے ان کے فن اور اسلوبِ فن سے متعلق بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ بھی دور ہو سکتی ہیں۔

میرزا نے آگرہ کی سکونت ترک کر کے دہلی کو مستقل وطن کی حیثیّت سے اس وقت اختیار کیا جب ان کی عمر غالباً چودہ سال تھی۔ علمِ نفسیات کے اصولوں کے مطابق یہ حصّۂ عمر ایسا ہوتا ہے جب ذہن میں داخلی و خارجی اثرات پورے طور پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ عمر کے اسی حصّے میں فرد کے اندر شخصیّت کے اظہار کی خواہشیں جنم لیتی ہیں۔ اس کی ذات اپنے لیے ایک مقصد متعیّن کرتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی تمام کوششیں وقف ہو جاتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ فرد کا شعور شخصیت کی نشو و نما کا امکانی ہیولا مرتّب کرتا رہتا ہے۔ میرزا بھی قدرتی طور پر ان

حالات سے گزرے، اور چوں کہ سربلندی و سرفرازی کا احساس قوی تھا اپنے مقصد کو پالیا۔ اس شعر میں اسی کیفیت کا اظہار ہے۔

بوادئی کہ دراں خضر را عصا خفت است
بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

اس راہ میں بے یقینی کے مضر اثرات تو ایک طرف، اپنے مقصد سے ذرا سی غفلت بھی ناخوش گوار نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ملک قمی نے اس حقیقتِ حال کو خوب بیان کیا ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

میرزا کی سوانح سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ ابتدائے سنِ بلوغ سے لے کر عالمِ پیری و حیاتِ دنیوی کے اختتام تک شدائد و مشکلات کے باوجود جن انوکھے طریقوں سے انھوں نے اپنی بلند شخصیت کا جا بجا اظہار کیا ہے۔ وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی ذات انفرادیت کے احساس سے ہر دم معمور رہتی تھی۔ طرزِ بیدل میں شعر کہنا بھی انفرادیت کے شدید احساس کی وجہ سے تھا اور اس کا ترک کرنا بھی اس وجہ سے ہے کہ ان کی انفرادیت نے اپنا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کیفیت سے متعلق ان کے خطوط میں ان گنت مقامات پر اشارات ملتے ہیں جن میں سے چند ہم پیش کرتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[1]

---

[1] خطوطِ غالب۔ مولانا مہر۔ ص ۲۹۶

" میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی، بعد رفعِ فساد سمجھ لیا جائے گا "

قاضی عبدالجمیل صاحب کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:[۱]

" اس زمین میں جس کا آپ نے قافیہ دردِ دل لکھا ہے میں نے کوئی غزل نہیں لکھی۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے کسی سے اس زمین کا شعر لے کر میرا کلام گمان کیا ہے۔ ہر چند میں نے خیال کیا۔ اس زمین میں میری کوئی غزل نہیں۔ دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے۔ اپنے حافظے پر اعتماد نہ کر کے اس کو بھی دیکھا۔ وہ غزل نہ نکلی۔ سنیے! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام سے پڑھتے ہیں۔ چناں چہ انھی دنوں میں ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے اسد اور لینے کے دینے پڑے۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا:

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مقطع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی، اور اگر میرا ہو تو مجھ پر

---

۱۔ خطوطِ غالب۔ مولانا مہر ص۱۳۵

لعنت ۔ اسد اور شیر، بت اور خدا اور جفا اور وفا
میری طرزِ گفتار نہیں ہے ۔"
اسی طرح منشی ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:[۱]

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں ۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے ۔"

اسی خط میں مندرجہ ذیل عبارت قابلِ توجہ ہے[۲]:

"اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں ۔ ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے ، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں ۔ جو لوگ قتیل کو اچھا لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے ؟"

علمائے فلسفۂ حیات کے نزدیک ہر ذی روح شے انفرادیت ، انانیت یا خودی کا احساس رکھتی ہے ۔ خواہ بہ اعتبارِ سطح اس شے کا تعلق نباتات سے ہو یا حیوانات سے اور اس سے ایک درجہ بڑھ کر انسان سے ۔ یہی وجہ ہے کہ نباتات سے لے کر انسان تک تحفظِ ذات کا شعور

---

[۱] ، [۲] ۔ خطوطِ غالب ، مولانا مہرؔ ۔ ص ۱۲۰ ۔ اس خصوص میں مزید تحقیق کے لیے خطوطِ غالب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

کم تر یا برتر درجے کے ساتھ سب میں پایا جاتا ہے اور یہی خلقی شعور ان کی ہستی کو باقی رکھتا ہے۔ حیوانات میں تحفظِ ذات کا شعور ایک کم تر درجے کے انفرادی احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اس آیۂ مبارکہ وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ میں اسی حقیقت کی جانب رہ نمائی کی گئی ہے۔ انسان چوں کہ حامل نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ہے اور کائنات میں قادرِ مطلق کی نیابت کا ذمہ دار ہے اس لیے اس کی ذمہ داریوں کی نسبت سے اس کی قوتوں اور صلاحیتوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کچھ حدیں بھی متعین کر دی گئیں جن کے اندر رہ کر وہ ارتقائے حیات کی راہیں طے کرتا ہے۔ انسانی جماعتوں اور گروہوں میں "انفرادی انانیت" اور "اجتماعی انفرادیت" کے خلقی احساسات اسی سفرِ حیات میں ابھرتے ہیں اور لحظہ بہ لحظہ، دم بہ دم بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اقبال نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسی حقیقت کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے:

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود ست

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

لیکن معاشرتی زندگی میں "با ہمہ رفتن" و "بے ہمہ شدن" کے اصول اگر حدِّ اعتدال سے بڑھ جائیں تو انفرادی زندگی کی تمام کشش اور جاذبیت بے رونق ہو کر رہ جاتی ہے۔ غالب کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی "انا" اور "بے خودی" میں ایک خاص درجے کی متناسبت پائی جاتی ہے جس نے ان کی شخصیّت کو نہ صرف پُرکشش اور باوقار بنایا ہے بلکہ ان کی شخصیّت کی گوناں گوں صفات کی وجہ سے ہم ان کو ایک گزری ہوئی تہذیب کا ترجمان بھی تسلیم کرتے ہیں۔

میر غالب سے کچھ کم انا پرست نہیں تھے لیکن ان کی "انا" اور "بے دماغی" میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ میر کی انانیت ان کی شاعری یا بے دماغی میں اس طرح گم ہے کہ اس کا سراغ کارے دارد کا مصداق ہے۔ برخلاف اس کے غالب کی انانیت ان کے فن میں بھی نمایاں ہے اور شخصیّت میں بھی۔ وہ مستِ صہبائے بے خودی ہوتے ہوئے بھی معشوق فریبی سے نہیں چوکتے۔ ان کی انانیت میں شعور و ادراک کی بالیدگی کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی انفرادیت محبوب کو سرگرم نیاز دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کوچۂ رقیب میں نقشِ پائے یار کو سجدہ کرتے ہوئے جانا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں[1]۔ ان کا پندارِ عشق ایسی نکونامی پسند نہیں کرتا جو طرب گاہِ رقیب کی تعمیر میں حصّہ لے اور خود کو محرومیوں اور ناکامیوں کے سامنے بے دست و پا بنا لے ان کی غیرت طاقت دیدار کو بھی دیکھ کر کڑھتی ہے:

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی رح نے بھی اس مضمون میں ایک کیف آور شعر کہا ہے:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن نہ دہم

غالب کے انا میں ایک خاص قسم کا تناسب اور نفسی اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے پندارِ خودی میں اس درجہ گم نہیں ہوتے کہ اپنی شخصیّت کو عرفی کی مانند آواز دیتے پھریں اور وہ "ہاں" اور "نہیں" کا جواب بھی نہ دے سکے بلکہ وہ اپنی

[1] مزید بحث راقم کے مضمون "غالب اور نرگسیت" مطبوعہ ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۵ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

شخصیّت اور انا پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں اور کسی طرح ڈھیل دینا پسند نہیں کرتے :

ہر ذرہ شتاب و بہ جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

میرزا کی انانیت میں فعّالی اور انفعالی، دونوں کیفیات کا امتزاج ہے جس نے ان کی شخصیّت کو دلچسپ اور پسندیدہ بنا دیا ہے۔ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رُخ پر نگاہ رکھتے ہیں اور دنیاوی حادثات پر حکیم اور فلسفی کے ذہن سے سوچتے ہیں :

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبضِ تپاں در رگِ صحرا بینند
شررے را کہ بہ ناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردا و بہ تارِ رگِ خارا بینند
قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورتِ آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
نستوہند اگر ہمرہِ مجنوں گردند
نخر وشند اگر محملِ لیلا بینند
دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دیرِ دو رنگ
ہر چہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند

مذکورہ سطور میں ہم نے عرض کیا ہے کہ غالب کی انانیت میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف "صاحبانِ عالی شان" کے مدّاح اور بہی خواہ ہیں، اپنے درباری اعزاز کی ترقی چاہتے ہیں، اور ہر چھوٹی بڑی تقریب پر انگریز حکّام کی شان میں قصیدے لکھتے ہیں۔

دوسری طرف محض اس بات پر دہلی کالج کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ "صاحب سکتر" اپنی نشست سے ان کی پذیرائی کے لیے کیوں نہیں آئے۔ ان دونوں طرزِ عمل میں بظاہر ایک طرح کا تضاد نظر آتا ہے لیکن معمولی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ قصیدہ گوئی فارسی شاعر کے ابوالآبا رودکی سے لے کر غالب کے عہد تک اظہارِ فن اور مرتبۂ سخن کے عیار کا وسیلہ رہی ہے۔ اس لیے اس عہد میں کسی شاعر کا کسی امیر یا سلطان کے لیے قصیدہ کہنا [خواہ اس میں صلہ کی تمنّا کا علانیہ اظہار ہی کیوں نہ ہو] کردار کی پستی اور طبیعت کی رکاکت کا باعث قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ قصیدہ گو شعرا کو جو اظہارِ کمال کے لیے مبالغے کی صنعت استعمال کرتے تھے، ہدفِ ملامت بنایا جا سکتا ہے۔ غالب کی قصیدہ گوئی بھی اظہارِ فن بشمول عرضِ مدّعا کے لیے تھی اس لیے ان پر شخصیّت کے تضاد کی تہمت رکھنا عقل و انصاف سے بعید ہے۔ انھوں نے قصیدے کی روایات کو آگے بڑھانے میں ضرور حصّہ لیا ہے لیکن اپنی شخصیّت کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھا ہے۔

اس کے علاوہ کسی کردار پر رکاکت، پستی یا خامی کا حکم اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب اس کردار کا کوئی قول یا عمل اس کی مسلّمہ عادت یا وضع کے خلاف ظہور میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص شراب پینے کو بُرا کہتا ہے اور ہمہ وقت شراب پینے والوں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے، اگر ہم اس شخص کو زندگی کے کسی دَور میں شراب پیتے ہوئے اور شراب پینے کی ترغیب دیتے ہوئے دیکھیں تو ہمیں شخصِ مذکور کے کردار کی پستی اور خامی کا یقین ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس کا عمل اس کی تمام زندگی کی وضع داری اور مسلّمہ

عادت کے خلاف پایا گیا ہے اور اس کے قول و عمل میں تضاد رونما ہوا ہے۔

غالب نے اپنے خطوط اور کلام میں کہیں دعوا نہیں کیا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی کو مذموم خیال کرتے ہیں بلکہ قصیدے ہیں جو ندرت اور بداعت انھوں نے قائم کی، اس پر فخر کرتے ہیں اور اپنے قصیدوں کو اپنے کمال کا عیار بتاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف جب اپنی عزّتِ نفس کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں تو اس کی حفاظت کے لیے ہر مادّی منفعت کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

غالب نے سہرے والے نزاع میں جو قطعہ بطورِ معذرت بہادر شاہ ظفرؔ کی خدمت میں پیش کیا تھا اس کا یہ شعر:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

ایک خاص اندازِ طبیعت کا غمّاز ہے۔ اس قطعہ میں بظاہر "سخن گسترانہ" معذرت پیش کر کے ناخوش گوار ماحول سے قطعِ نظر مقصود تھی لیکن میرزا صاحب کے باطن میں جاگزیں "شخص" کا مطمحِ نظر اس باب میں مختلف تھا۔ شاعری اور سپہ گری' دونوں ایک عظیم فرد کے لیے وجہِ افتخار نہیں بن سکتیں۔ ہاں وجہِ افتخار اگر کوئی حقیقت ہے تو "خودگری و خودنگری" ہے، جس کا میرزا صاحب پوری طرح احساس رکھتے تھے اور جس کا اظہار انھوں نے متعدّد مقامات پر کیا ہے:

اگر ز شحنہ بود داد و گیر نندیشیم

دگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

بجنگ باج ستانانِ شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بگوشۂ بہ نشینیم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

○

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئیں درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

○

نفس موجِ محیطِ بےخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

○

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ان مقامات پر غالب نہ سپاہی رہتے ہیں اور نہ شاعر۔ وہ ایک انسان نظر آتے ہیں۔ ایسے انسان جنھیں اپنی انسانیت اور اس کی عظمتوں کا پورا پورا احساس ہے۔

اس مقام پر زیرِ نظر موضوع کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ میرزا نے اپنے متعدد خطوط و اشعار میں اپنی شاعرانہ استعداد اور فنی دستگاہ کی ناقدر شناسی کے سلسلے میں ابنائے روزگار سے جو شکایتیں کی ہیں، وہ ان کے خطوط اور اردو فارسی کلام کے مطالعے سے واضح ہو جاتی ہیں! اس قسم کی ناقدری اور حوصلہ افزائی نہ ہونے سے ان احساسات وجذبات کا

ردِعمل ہوتا ہے وہ سب میں مشترک پائے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے جملہ اہلِ کمال اور علمائے فن نے اپنی تصانیف اور ادبی شہ پاروں میں ان تلخ اور ناگزیر احساسات کے نقوش چھوڑے ہیں۔ میرزا درفش کاویانی میں تحریر کرتے ہیں[1]:

"پنجاہ و دو سال مغزِ سخن کافتم۔ امروز کہ شصت و ششمین سال از عمرِ گریزاں می گزرد، سخن آفریں را سپاس گزارم، وہم جز آں بخشندۂ بخشایش گر کس نیارد دانست کہ دریں پنجاہ و دو سال، چہ درہائے معنی بروئے من کشادہ اند و کرسیِ اندیشۂ مرا در فرازستانِ آگہی بکدام پایہ نہادہ اند حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند۔ مرا خود دل برآناں می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرّۂ ایزدی گشتند و ازیں نمایش ہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام سرگرداں گزشتند۔ گوئی نظیریؔ ہمدردِ من و مقطعِ آں مینو آرامش گاہ نوائے سازِ دمِ سرِ دمِ من است:

تو نظیریؔ ز فلک آمدہ باشی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

مذکورہ عبارت میں میرزا نے جن تلخ اور دلریش احساسات کو پیش کیا ہے، ان کے بغور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کمال میں یہ انقباض اور تلخی دراصل ان کی انانیت اور انفرادیت کے احساس کو ٹھیس

---

[1] بحوالہ ذکرِ غالب از مالک رام

لگنے سے پیدا ہوتی ہے جیسے وہ بہ تقاضائے حالات برداشت کرتے ہیں لیکن ان کی انانیت اس صورتِ حال سے غیر مطمئن رہتی ہے اور اپنی حیثیت تسلیم کرانے کے لیے احتجاج کے نئے نئے طریقے اختیار کرتی ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

نظیری نیشاپوری کا زمانے سے یہ شکوہ:

بہر کجا روم اخلاص را خریدار یست
متاعِ کاسدو بازارِ نارواایں جاست

اقبال کی یہ آرزو "دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھا دے" یا مرزا کا یہ تلخ احساس:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالب دشمن آسماں اپنا

ایک ہی جذبے کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ مایوسیاں اور شکایتیں جو بہ اقتضائے بشریت ہیں، اضطراری ہوتی ہیں اور جوں جوں شاعر یا ادیب شخصی ارتقا کے منازل طے کرتا جاتا ہے، اس کی ذات میں ایک خاص یقین و طمانیت کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت اسے زمانے سے نہ شکایتیں ہوتی ہیں اور نہ قدر ناشناسی کا رنج۔ وہ اپنی عظمت و بلندی کے نغمے گاتا ہوا آگے ہی بڑھتا رہتا ہے:

در گرم روی سایہ و سر چشمہ نہ جوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نہ تواں گفت

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ کمال ہر دور میں نامساعد حالات سے گزرتے ہیں ان حالات میں کسی صاحبِ کمال کا منزلِ مقصود تک پہنچنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قوی دل و دماغ کا انسان ہے۔ میرزا بھی ایسے ہی قوی دل و دماغ کے انسان تھے۔

---

# تقلیدِ محض سے اجتناب

اگر ہم انسان کے ذہنی ارتقا کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آغاز سے تا ہنوز پوری ذہنی تاریخ چند ادوار میں منقسم ہوتی ہے۔ تاریخِ تمدن نے ان تبدیلیوں کا نام کبھی "پتھر کا زمانہ" رکھا ہے کبھی "دھاتوں کا زمانہ"۔ اسی طرح ان ادوار کی تقسیم موجودہ دور تک چلی آتی ہے۔ جب ہم کسی خاص عہد کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس خاص عہد میں انسانی ذہن ایک خاص سطح پر تھا۔ اس کے غور و فکر اور عقل و تدبّر کی ایک خاص منزل تھی۔ اسی دایرے میں رہ کر انسان وظائفِ حیات کی تکمیل کرتا تھا۔ لیکن حیات فطری طور پر ترقی پذیر ہے۔ انسانی ذہن ایک حالت پر قانع نہیں رہ سکتا تھا۔ چناں چہ ہر عہد کے انسان نے اپنے ذہنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ماحول میں تبدیلیاں کیں جو عہدِ سابقہ کے ماحول سے زیادہ ارتقائی صورت میں تھیں۔ اس طور پر صدہا درجات سے گزرتے ہوئے آج کے انسان کا ذہن اس سطح پر آیا ہے جسے ہم "ایٹم کا زمانہ" کہتے ہیں۔ اور کون جانے ابھی اسے کتنی منزلوں سے گزرنا باقی ہے۔ شاید عارفِ رومی نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے:

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

اس مختصر جائزے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی ذہن ابتدا سے اب تک ترقی پزیر رہا ہے اور ترقی پزیر رہے گا۔ لیکن جب ہم گزشتہ ادوار کی ذہنی تاریخ کا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں تو ایک حقیقت اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں انسانوں کی اکثریت نے کسی خاص تبدیلی کو جو اس عصر کا ذہنی مطالبہ ہوتا ہے، ہمیشہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا ہے۔ اس کا غالب سبب یہ ہے کہ عام لوگ فطری تبدیلیوں کو زندگی کے لیے شر اور بدعت خیال کرتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے بتائے ہوئے طریقوں میں کسی تبدیلی کو قابل قدر نہیں سمجھتے۔ تاریخ و تمدّن کی اصطلاح میں زندگی سے متعلّق یہ طرزِ عمل تقلید کہلاتا ہے۔

چناں چہ تمدّنی تاریخ کے اوراق اس امر پر شاہد ہیں کہ جب کسی صاحبِ فکر و نظر نے معاشرتی زندگی میں انقلاب لانے کی سعی کی اور اپنے عہد کے انسانوں کو فطرتِ کائنات کے اصولوں سے ہم آہنگ ہونے کی دعوت دی تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس پیکرِ سعی و عمل کی صداقتِ فکر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ پوری قوّت سے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اس مخالفت کی بنیاد بھی یہی کم نظری تھی کہ عوام النّاس کو جس مسلکِ حیات کو اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی، اس پر نہ ان کے آبا و اجداد نے زندگی گزاری تھی اور نہ وہ خود مفید و غیر مفید طریقِ حیات کی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کا مقصدِ حیات ماضی کے دیے ہوئے فرسودہ قوانین پر بے سوچے سمجھے عمل کرنا تھا۔ یہی بے بصری اور جہالت علامتِ ایمان تھی۔ حالاں کہ کسی داعیِ انقلاب کا مقصد یہ ہرگز

نہ تھا کہ قوم کی ثقافتی نشانیوں یا تہذیبی ورثے کو یکسر ختم کر دیا جائے۔
وہ تو یہ چاہتا تھا کہ قدیم افکار و عمل میں اس طرح تبدیلی رونما ہو کہ معاشرہ نئے تقاضوں کے مطابق وظیفۂ حیات کی تکمیل کرے۔ اس طور پر ترقیِ فکر و عمل کا جو مفہوم لیا جائے گا وہ یہ ہو گا کہ نئے مسلک میں قدیم روایات و جدید تصوّرات کا توازن و اعتدال برقرار رہے اور معاشرہ نئے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارتا رہے۔ گویا نہ تقلید کے معنے یہ ہوں گے کہ جو راستے فرسودہ ہو چکے ہیں ان کو اختیار کیا جائے اور گزشتہ عہد کے تصوّرات و نظریات، جو عصرِ جدید کی ذہنی سطح سے پست ہیں، ان سے سرِ مُو تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ روشِ زندگی جہالت و ظلم ہے جس کا نتیجہ تعمیری نہیں ہو سکتا۔ ادب و فن بھی چوں کہ انسانی ذہن و حیات کے شعبے ہیں اس لیے ان پر بھی وہی اصول منطبق ہوتے ہیں جو عام معاشرتی زندگی میں کارفرما ہیں۔

تقلید و ترقی کے مذکورہ مفہوم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ غالب نے اس خصوص میں کیا طریقۂ کار اختیار کیا ہے؟ اس طریقۂ کار کی مثالی حیثیت کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس کی افادیت کس حد تک معیّن کی جا سکتی ہے؟ ان سوالات کی وضاحت کے سلسلے میں ہمیں میرزا کے ابتدائی اور مابعد کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ از سرِ نو کرنا چاہیے۔

میرزا کے اس خط سے جو انھوں نے شمس العلما مولوی ضیاالدّین خاں ضیاؔ دہلوی کو تحریر کیا ہے[1]۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ادبی و تنقیدی ذوق کی تربیت میں ملّا عبدالصمد ایرانی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم

---

[1] ۔ غالب نامہ۔ ص ۲۷

ہے کہ ملا عبدالصمد مسلمان ہونے سے قبل پارسی مذہب کے پیرو تھے۔
ظاہر ہے کہ انھوں نے دینِ اسلام کسی تقلیدی اثر سے نہیں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت
قبول کیا ہوگا۔ انھوں نے اپنے قیامِ آگرہ کے زمانے میں میرزا کو ان ہی امور
کی زیادہ تلقین کی ہوگی جو تقلیدی راہوں کی بجائے علم و بصیرت کی طرف
لے جاتے ہیں۔ اس پس منظر کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے
کہ میرزا جو خود ایک باشعور ذہن و دماغ کے مالک تھے، اپنے استاد کے
حالاتِ زندگی سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے
اپنے مسلک و مشرب میں آزاد رہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے
اس طریقِ زندگی کو جو انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا تھا، اختیار
نہیں کیا۔ اس کے برخلاف ادبی زندگی کو اپنا مسلک ٹھہرایا، اور ان ذہنی
تقاضوں کو پورا کیا جو مکمّل اور مستحکم شخصیت کی تشکیل کے بنیادی اجزا ہیں۔
اپنے ایک فارسی شعر میں اس طرزِ عمل کا جواز پیش کرتے ہیں :

یا من میا ویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

میرزا اپنے نظریہ میں اس قدر راسخ اور انتہا پسند تھے کہ بالآخر
"برہانِ قاطع" کے سلسلے میں انھیں ناخوشگوار واقعات و حالات کا
سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے وہ اہلِ زمانہ سے دل برداشتہ بھی ہو گئے
تھے۔ ان ناخوشگوار واقعات کا سبب یہی تھا کہ وہ کسی ایسی بات کو
تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے جو علم و بصیرت کے معیار پر پوری نہ اترے۔
میرزا کی یہ آزادہ روی شعر و شاعری پر موقوف نہ تھی بلکہ وہ دیگر معاملاتِ
دنیاوی میں بھی اس پر عمل کرتے اور اپنے تلامذہ کو اس کی تلقین کرتے

رہے ۔ میر سرفراز حسین نے فقہ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ ان کو میر جعفری کی طرف سے تحریر کرتے ہیں[1]:

"میاں کس قصّے میں پھنسا ہے ـــ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔
طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ ۔ جو آدمی بنا چاہے"

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ان کے خطوط میں ملتی ہیں جہاں وہ آزاد منش انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور اپنے متعلقین کو اس قسم کی ہدایت کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ مکمل شخصیّت کا امتیاز یہی ہے کہ وہ غلط اور صحیح امور میں درک حاصل کرے اور تقلیدی روش سے خود کو محفوظ رکھے۔

ملّا عبدالصمد کی تعلیمات سے استفادہ کرنے کے علاوہ بعض اور اسباب بھی میرزا کو ایک آزاد نظریہ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ۔ ان میں سے ایک سبب عقائد و علومِ دینیہ کی تحقیق کا آغاز تھا جس کے بانی و محرک شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی[2] اور ان کے متبعّین تھے شاہ صاحب کے علمی کارناموں سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے اس برِّصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی ، مذہبی اور ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ۔ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے مسلمانانِ ہند کو جس نئے اندازِ فکر کی دعوت دی تھی ان کے متبعّین اسے عام کرنے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کی سب سے بڑی وجہ غیر ملکی اثر و اقتدار کا بڑھنا تھا ۔ نئے حکمران اپنے ساتھ اپنے ملک کی تہذیب ،

---

لے ۔ غالب نامہ ۔ ص ۳۲۱ ۔ شیخ محمد اکرام

تمدنی روایات اور علمی تصورات و نظریات بھی لائے تھے جس کا اثر مسلمانوں کی معاشرتی و مذہبی زندگی پر بھی پڑا۔ چناں چہ وہ حضرات جو حالات و واقعات کی رفتار سے باخبر تھے، مجبور ہوئے کہ ایک نئے انداز فکر سے مسائلِ حیات کو سمجھیں اور عوام کی ذہنی تربیت اسی انداز سے کریں تاکہ نئے حالات کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جا سکے۔

اس تحریک کے داعیوں میں سید احمد بریلوی رح، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رفقا تھے۔ چوں کہ مذکورہ تحریک کی بنیادی خصوصیت جدید رجحانات کی آئینہ دار تھی اس لیے اس کے محرکین عوام میں غیر مقلد اور وہابی مشہور ہوئے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اس تحریک کا عالمِ وجود میں آنا امرِ ناگزیر تھا۔ اس وقت اسلامیانِ ہند جس سیاسی، مذہبی، اور معاشرتی بحران سے دوچار تھے، اس کا حل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دینی و معاشرتی روایات کی حفاظت کریں اور غیر ملکی تسلط کو جلد از جلد ختم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جدید نظریات اور میلانات کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ بحرانی حالات میں ایسی تبدیلیاں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بہر حال مسلمانوں میں اپنی حالت بدلنے کا احساس ایک فالِ نیک تھی۔ چناں چہ اس تحریک کی ابتدا کے کچھ عرصے بعد ہی مسلمانوں نے ان غیر ملکیوں سے اپنا حق واپس لینے کے لیے اس عملی جدّوجہد کا آغاز کیا جسے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کہتے ہیں اور جسے انگریزوں کی خانہ ساز تاریخ میں "بغاوتِ ہند" کا نام دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ تحریک چند جوشیلے اور ناتجربہ کار کارکنوں کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن حالات کے سازگار ہوتے ہی جب آزمودہ کار اور ذہین رہنماؤں

کی قیادت میں اس تحریک کو جاری کیا گیا تو بالآخر انھوں نے وہ مقصد پالیا جس کے تحت اس کا آغاز ہوا تھا۔

بللہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

اس تحریک کے ابتدائی ایام میں جب کہ شمالی ہندوستان کے عوام نئے حالات و مسائل سے دوچار تھے، میرزا آگرہ کا قیام ترک کر کے دہلی میں آباد ہوئے، اور ان اکابر سے ان کے مراسم و تعلقات قائم ہوئے جو کسی نہ کسی حیثیت سے اس انقلابی تحریک سے وابستہ تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر دارالخلافہ میں پیدا ہونے والے حالات کا مطالعہ کیا۔ جدید نظریات اور تصوّرات کا جو دارالخلافہ کی مجلسی زندگی میں عام ہو رہے تھے، خیر مقدم کیا اور اپنی ادبی زندگی کے لیے وہی راہ متعیّن کی جو کورانہ تقلید سے آزاد رہنے والے افراد اختیار کرتے ہیں۔

میرزا کے ہر تذکرہ نگار نے مذہب کے باب میں ان کی 'آزاد خیالی' کو متفقہ طور پر بیان کیا ہے شخصیّت و کردار کا یہ رخ دُنیا کے ہر تخلیقی نابغہ (CREATIVE GENIUS) میں مشترک نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں آزاد بلکہ بڑی حد تک غیر متعلّق سا واقع ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس بے تعلّقی کی بڑی وجہ قلبی واردات و داخلی کیفیات کی وسعت کے علاوہ مذہب کے مختلف مکاتیبِ فکر کی بے جا نزاع و تکرار ہے۔ ایک باشعور انسان جو نظامِ کائنات میں چند اصول و قوانین کے نفاذ کو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے جاری و ساری دیکھتا ہے، کبھی ایسے نظریات کو تسلیم نہیں کر سکتا جن میں ضمیرِ کائنات سے ہم آہنگی موجود نہ ہو۔

چوں کہ تخلیقی نابغہ مشاہدۂ کائنات کے اس مقام پر ہوتا ہے جہاں زندگی
لامحدود پہنائیوں میں سرگرمِ عمل ہوتی ہے، اسے فطری طور پر بے جان رسم و
رواج کی پابندیوں سے اِبا ہونے لگتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں میرزا
نے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے میرا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

عارفِ رومی نے اسی بات کو اپنے خاص اندازِ بیاں کے ساتھ پیش کیا ہے:

موسیا آدابِ داناں دیگر اند
سوختہ جان و روانان دیگر اند
ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

ملّتِ عشق از ہمہ دیں ہا جدا ست
عاشقاں را مذہب و ملّت خدا ست

اقبال بھی جو پیرِ رومی سے ذہنی طور پر متاثر ہیں، اس باب میں "آزاد
پابندی" کا اعلان کرتے ہیں:

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

مذہب کے معاملے میں میرزا کی آزادہ روی و سیر مشربی کا سبب جو ان کا ادبی مسلک بھی ہے، اپنے ہم عصر اہلِ علم کے نظریات کا بغور مطالعہ ہے جن میں ایک طرف شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی جیسے عالمِ دین تھے تو دوسری طرف سیّد احمد خاں جیسے ترقی پسند مذہبی، سیاسی و معاشرتی راہ نما تھے۔ ان کے علاوہ دیگر احباب تھے جن سے ان کا تعلّق نجی و ادبی نوعیّت کا تھا۔ ان حضرات میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مفتی صدر الدّین آزردہ، اور حکیم مومن خاں مومنؔ شامل تھے۔ ان سب کے علاوہ حضرت شاہ نصیر الدّین کالے میاں سے بھی ان کے روابطِ نیاز مندانہ قائم تھے جو مولانا فخر الدین فخرِ دہلی کے پوتے اور ان کے صاحبِ سجادہ تھے اور اس وقت کے مشہور صوفیہ کرام میں شمار کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک باشعور انسان جب اتنے اہلِ کمال سے جو مختلف مکاتیبِ فکر سے متعلّق ہوں، روابط رکھتا ہو تو اس کی شخصیّت میں آزادیِ خیال کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ میرزا نے اس آزادیِ خیال کا اظہار عام معاملاتِ زندگی میں بھی کیا ہے اور خالص ادبی مباحث میں بھی۔ مرزا تفتہؔ کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں[1]:

"بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔"

شعر و ادب کے باب میں بھی میرزا کو رانہ تقلید اور بے جا پابندیوں کو

---

[1] ۔ غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۳۲۰

روا نہ رکھتے تھے اور اس خصوص میں ان کا جو زاویۂ نگاہ ہوتا تھا اس کو صاف صاف بیان کر دیتے تھے۔ مرزا تفتہ کے نام ان کے چند خطوط کے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا اس باب میں کیا نظریہ تھا:[1]

"ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں؟ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

میری جان ایسے موقع پر یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہے گا حضرتِ صاحبؒ کو۔"

اس خط میں میرزا صاحب نے صحتِ زبان کی تنقید سے متعلق جو اصول سامنے رکھے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) قدما میں سے جن شعرا نے لسانی غلطیاں کی ہیں ان کا اعادہ سند خیال کر کے نہ کرنا چاہیے بلکہ اپنے کلام کو لسانی غلطیوں سے پاک رکھا جائے۔

(۲) زبان کی تحقیق اور صحت کے لیے جملہ مساعی کی جائیں۔

(۳) بزرگوں کو کسی غلطی یا سہو کی بنا پر ہدفِ ملامت نہ بنایا جائے۔[2]

---

[1] خطوطِ غالب مولانا مہر ص ۱۲۲۔ [2] واضح رہے کہ میرزا صاحب کا یہ احترام ان شعرا کے لیے تھا جو مسلّم الثبوت اہلِ زبان تھے ورنہ "فارسی نویسانِ ہندی" کو وہ خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔

ان اصول کی معقولیت اور افادی حیثیت سے انکار کرنا ہمارے نزدیک سخت ناانصافی ہے۔ یہی اصول اگر شعر و ادب سے قطعِ نظر عام مسائل حیات پر منطبق کر دیے جائیں تو ان کے فوائد سے بہر طور مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرے خط میں مرزا تفتہ کو تحریر کرتے ہیں[۱]:

"کند آں آہوئے وحشی ز برم فر دارم"

یہ شعر سوید میر کے کلام کا ہے، 'بر دارم و زر دارم، و 'سر دارم'، و 'فردارم' یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں۔ الف ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں 'بودارد'، و 'رودارد'، و 'فردارد'، تمھارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر استاد کا نہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاء الدین

ما مقیمانِ کوئے دل داریم

یہ ترجیع بند انھی کا ہے۔ ان کو فقر و فنا و سلوک میں (سند) سمجھنا چاہیے نہ اندازِ کلام میں۔"

ایک اور خط میں کسی قدر شوخی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں[۲]:

ز ترکتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز
ز سبزہ می دمد انگشتِ زینہار ہنوز

حزیںؔ کے اس مطلع میں واقعی ایک 'ہنوز' زائد اور بے ہودہ ہے۔ تتبّع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلطِ محض ہے۔ یہ سقم ہے یہ عیب ہے اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیںؔ تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کی سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔"

---

۱۔ خطوطِ غالب۔ مولانا مہر ص ۱۳۷۔ ۲۔ خطوطِ غالب از مہر ص ۱۳۹

عام طور پر ہمارے تذکرہ نگار اور نقاد (بہ استثنائے چند) اپنے تنقیدی شعور کی برتری اور عام روش سے اجتناب ظاہر کرنے کے جوش میں خوش نما اور معقول اصول قائم کرتے ہیں۔ لیکن یہ اصول ان کے نتائجِ فکر اور شخصیت سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے دلیل کے درجے سے گر جاتے ہیں اور ان کی شخصیت بے اثر نظر آتی ہے۔ مذکورہ خطوط میں معانی و بیان سے متعلق جو اصول میرزا صاحب نے متعین کیے ہیں ان کا نفاذ ان کے کلام اور ان کی سیرت و شخصیت میں واضح طور پر نظر آتا ہے اور یہی خصوصیت فن اور ذات سے خلوص کا واضح اظہار ہے اسی خلوص کی بنا پر ان کی شخصیت میں جاذبیت اور دلکشی محسوس ہوتی ہے۔

اس دور میں جب کہ انسانی عظمت و شرافت کی تنقید کے معیار بدل گئے ہیں اور زندگی کی مستقل قدریں چند خود ساختہ و پرداختہ نظریات کے سبب خطرے میں ہیں، ضرورت ہے کہ ان فطری اقدار کی حفاظت کی جائے جن کے اختیار کرنے سے انسانی شخصیت زندگی کے اعلا معیار قائم کرتی ہے۔ اور انسانیت کو نئی منزلوں اور نئے جہانوں سے آشنا کراتی ہے۔ اور ان فرسودہ و بے روح قوانین سے انحراف کیا جائے جن کی وجہ سے انسانی ذہن طاغوتی طاقتوں کی زنجیروں میں مقید ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں مقام "لا" سے گزرے بغیر منزل "اِلّا" میں پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ میرزا کی شخصیت میں منفی و مثبت، دونوں عوامل کا اثر پورے اعتدال کے ساتھ موجود ہے جس کو انھوں نے اپنے خطوط اور اردو، فارسی اشعار میں جستہ جستہ بیان کیا ہے۔

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل دو شعر عام روش سے متعلق ان کے
نظریہ کی وضاحت میں پیش کیے جا سکتے ہیں :

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیِ فرہاد نہیں

○

ہے کیا ضرور سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

پہلا شعر ایک ایسے فرد کے جذبات کو صورت نفی میں پیش کرتا
ہے جو غلط طریقۂ کار کی پیروی کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے شعر میں جہد و عمل
کے ایجابی پہلو کو ایک خاص شوخی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ میرزا کی سیرت و
شخصیت کے یہی دِل کش پہلو اہلِ ذوق کو کیف و سرمستی کا پیغام
دیتے ہیں۔

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم رسم بر فریاد و افغانم نمی آید

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصلاحِ شعر کے باب میں میرزا
کا طریقۂ کار دیگر اساتذۂ فن سے مختلف تھا۔ اس اختلافِ عمل کے ضمیر میں
وہی نفسیاتی کیفیت کارفرما تھی کہ وہ عام روش سے ہٹ کر سوچتے
اور عمل کرتے تھے۔ اس دور کا عام رواج یہ تھا کہ شاگرد نے غزل یا دیگر اصنافِ
نظم میں سے کوئی کلام استاد کو پیش کیا۔ استاد نے اس کی اصلاح کر کے
شاگرد کو واپس کر دیا۔ شاگرد نے مسودہ صاف کر کے مشاعرے میں پڑھ دیا
یا اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کر دیا۔ اصلاح کی ضرورت اور اس کے متعلقات

سے شاگرد کو معلومات فراہم کرنا غیر اہم تصوّر کیا جاتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ آگاہی ان کے استعمال تک محدود تھی۔ نفسِ شاعری، اس کے اثرات اور انسانی تمدّن میں اس کی اہمیّت سے خود اساتذہ بے خبر تھے۔ تلامذہ کو واقف کرنے کی کون زحمت کرتا؟ ظاہر ہے یہ سرسری طریقہ (RUTINE) شاگرد کی حقیقی تشفّی اور اصلاح کا سبب نہیں بن سکتا اور ایسی صورت میں تلامذہ کی تخلیقی صلاحیتوں کے روبکار آنے کی کوئی توقّع نہیں کی جا سکتی۔ میرزا نے اس کے برخلاف یہ طریقہ رائج کیا کہ وہ اصلاح کی ضرورت اور اس کے اسباب سے شاگرد کو مطلع کرتے۔ امثال و نظائر سے اپنی اصلاح کو ذہن نشین کراتے اور فن اور اس کے متعلّقات سے بھی بحث کرتے تھے۔ اس نوعیّت سے تلامذہ کے کلام کی اصلاح ہر اعتبار سے افادیت کی حامل ہوتی تھی۔ کیا یہ قیاس غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ مولانا حالی نے مقدمے میں جس تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے اس میں غالب کے ذہن و مزاج کا وافر حصّہ شامل نہیں ہے؟

میرزا خود بھی جو کچھ کہتے تھے اس کا انداز مروّجہ طریقوں سے مختلف تھا۔ ان کی انفرادیت اس امر کی متحمّل ہی نہ تھی کہ وہ اپنے کلام میں عام رنگ کی پیروی کریں۔ میرزا تفتہ کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"کیا ہنسی آتی ہے تم پر۔ مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا۔ اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول وَلاقوۃ اِلّا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیشِ نظر رکھ

لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ تو دیکھ لیا اور اس زمین میں
غزل اور قصیدہ لکھنے لگا۔ بھائی، شاعری معنی آفرینی ہے
قافیہ پیمائی نہیں"

نفسِ شاعری سے متعلق میرزا کی یہ رائے کسی شرح و تفصیل کی محتاج نہیں ہے۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ ندرتِ خیال اور معنی آفرینی میں جو شاعرانہ حسن اور پاکیزگی ہے اس کو قافیہ پیمائی کے لیے جان پیکر سے دور کی نسبت بھی نہیں دی جا سکتی۔ اوّل الذکر صفت اپنی ذات میں ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور موخرالذکر نشو و نما کی صلاحیت کو سرے سے ختم کر دیتی ہے۔

بیدل تو جنوں کن و ازیں ورطہ بدر زن
عالم ہمہ زندانیِ تقلید و رسوم است

غالب نے اپنی شاعری کے لیے عہدِ مغلیہ کے فارسی شعرا سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اسے تقلید کہنا اس دور کی شاعری کے عام رجحانات اور غالب کے فکری و جذباتی میلانات سے لاعلمی کا اظہار ہے۔ جلالؔ، امیرؔ، ناصر علی، اور عرفیؔ مصنوعی شاعری کے دل دادہ اور لفظی بازی گر ہیں۔ ان کے ہاں تازہ راہوں کی تلاش محض ایک سراب ہے یا ایک طلسم خانہ، جہاں خیال شاعری کی بھول بھلیوں میں قید اور پا بہ گِل ہے۔ غالب اگر مقلد ہوتے تو ناسخؔ سے زیادہ نہ بن سکتے تھے۔ جنھوں نے صائبؔ کی تقلید میں اپنی شاعری اور مہارتِ فن کو ضائع کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ دبستانِ لکھنؤ نے غزل کو ایک نئی زبان اور نیا پیرایۂ بیان عطا کیا لیکن عظیم شاعری اور صناعتِ الفاظ میں بڑا فرق ہے۔ ہماری شاعری کو مجموعی طور پر دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی انیسؔ و دبیرؔ

کے مرثیے بھی نہ کر سکے۔ غالبؔ ناسخؔ نہ بن سکتے تھے۔ انھوں نے بیدلؔ بننا بھی گوارا نہ کیا۔ مصنوعی شاعری اور اس کے لوازمات جو آخری مغلیہ عہد کے شعرا کا طرۂ امتیاز ہے ان کے ذہن کو مطمئن نہ کر سکے۔ عظیم انسان تقلید سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ اس کا فکر پامال گزرگاہوں سے دور اپنا نشیمن بناتا ہے :

زبس کہ پیروئ خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفت ست

---

# خذ ما صفا ودع ما کدر
# کا اصول

دورِ حاضر میں جب کہ مختلف مکاتیبِ فکر زندگی کے رموز و اسرار کی پردہ کشائی کر رہے ہیں، یہ فیصلہ کرنا کہ کون سے نظریاتِ زندگی کے لیے حقیقی طور پر سود مند ہیں اور کس طرزِ عمل سے انسانیت کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے، آسان و سہل نہیں ہے۔ یہ صورتِ حال عہدِ حاضر تک مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں "کتابِ زندگی" کی ایسی ہی غلط تعبیریں کی گئی ہیں اور انسان اپنے وضع کردہ تصورات کے پیچ وخم میں خود حیراں و سرگرداں رہا ہے ورنہ زندگی کی راہ تو ایک کھلی ہوئی راہ ہے۔ اگر حقیقت بیں نگاہوں سے اس کی سادگی و صداقت کو دیکھ لیا جاتا تو اس قدر حیرانی و سرگرانی کی کیا وجہ تھی ؟ درحقیقت اچھائی یا برائی کا معیار وہ نظریات نہیں ہیں جو افراط و تفریط سے لبریز اور رطب و یابس سے پُر ہیں۔ بلکہ ان کا معیار وہ غیر متبدّل اصول ہیں جو عالَمِ کائنات میں اور خود انسان کی زندگی میں بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری ہیں۔ اگر کسی جماعت یا فرد کی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر ہوتی ہے تو ان کی زندگی ہر اعتبار سے کامل اور کامیاب ہو گی، اور اگر ان قوانین سے انحراف کیا جائے گا تو محرومی و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

اس نقطۂ نظر سے میرزا کی شخصیت کا مطالعہ کہ ان کی ذات میں سود مند

اصول اخذ کرنے کی صلاحیت کس درجہ تھی، خاصا دلچسپ اور اہم ہے، اور اسی اعتبار سے ان کی شخصیت کا موازنہ ہم عصر شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔

میرزا اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بیدؔل کی طرز کا تتبع کرتے تھے۔ چناں چہ اس دور کے کلام میں خیالی پیچیدگیاں، عجیب و غریب مضامین اور دُور از کار تشبیہیں کثرت سے ہیں اور شعر کا حقیقی حُسن اور فعالیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن یہ میرزا کی سلیم الطبعی اور متوازن ذہن و دماغ کا کرشمہ تھا کہ جب ان کو ان نقائص کا علم ہوا جو شعر کے حقیقی حُسن کو زائل کر دیتے ہیں تو انھوں نے بغیر کسی تکلف کے بیدؔل کے رنگ میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور اپنے منتخبہ دیوان میں سوائے چند اشعار کے سب کو قلم زد کر دیا۔ اس تبدیلیٔ فکر کو خود میرزا کی زبان سے سنیے۔ مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:[1]

"ابتدائے فکرِ سخن میں بیدؔل و اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چناں ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرزِ بیدؔل میں ریختہ لکھنا
اسدؔ اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے"

---

[1] خطوطِ غالب از مولانا مہر۔ ص ۲۳۵

"طرزِ بیدل" ترک کرنے کے بعد میرزا نے اپنی شعری صلاحیت اجاگر کرنے اور اظہارِ فن کے اسلوب میں جو روش اختیار کی، وہ بذاتِ خود "خذما صفا" کے اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ اندازِ فکر کی اس تبدیلی نے ان کی شخصیت میں غایت درجے کا اعتدال اور وزن پیدا کر دیا تھا۔ خیالی مضامین کی منزل سے گزر کر اب وہ ایسے مقام پر آ گئے تھے جہاں فن کار کا ادراک اور تعقّل احساس اور جذبے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور جہاں شاعر کی نوا اور مغنّی کا نفس ایک ہی کیفیّت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در رگِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

عہدِ مغلیہ کے تین صد سالہ دورِ حکومت میں فارسی اور اردو شعرا اپنے مزاج اور میلاناتِ شاعری کی بنیاد پر دو طبقوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ طبقۂ اوّل میں فیضیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، قدسیؔ، کلیمؔ اور طالبؔ ہیں جنھوں نے فغانیؔ کی طرز کو برقرار رکھتے ہوئے حکمت و آگہی کے چراغ روشن کیے اور شاعری کو "بیکاروں کے مشغلے" کے طعنوں کا ہدف نہ بننے دیا۔ ان شعرا کی آوازوں میں سرخوشی و سرمستی کی جو ایک مخصوص لَے محسوس ہوتی ہے اسے ابتدائی مغلیہ سلطنت کی برکات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ لوگ بساطِ سخن کو الٹ کر چلے گئے اور دوسرے طبقے کے شعرا نے نئے سرے سے بزمِ سخن کو برپا کیا۔ بیدلؔ، نعمت خاں عالیؔ، ناصر علی سرہندی، غنیؔ کاشمیری، طبقۂ اوّل کے شعرا کی روایت کو آگے نہ بڑھا سکے۔ ان کی ناکامی میں شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی شامل تھا۔ اکبر، جہاں گیر، اور شاہ جہاں جیسے اولوالعزم اور صاحبِ تدبیر سلاطین کہاں سے آتے؟

اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کو بیرم خاں، ابوالفضل، فیضی، ابوالفتح شیرازی جیسے وفادار اُمرا میسّر نہ ہو سکے نتیجے کے طور پر مغلیہ سلطنت کا آفتابِ اقبال رُو بہ زوال ہونے لگا۔ طبقۂ دوم کے شعرا کے ہاں اس زوال آمادہ تہذیب کی عکّاسی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ تفاول و مسرّت کے ابھار کی جگہ وقتی جوش اور شدّتِ بیان نے لے لی۔ حکمت و آگہی کے ابلاغ کی بجائے دور از کار تشبیہات و استعارات سے ذہن کو آسودہ کیا جانے لگا۔

ہمارے اردو شعرا طبقۂ اوّل کے فارسی شعرا سے متاثر تو ہوئے لیکن گردشِ زمانہ نے ان کو اتنی دور پہنچا دیا تھا کہ گزشتہ روایات کی بازیابی اور اس کو آگے لے کر بڑھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ مظہر جانِ جاناں، میر، سودا اور درد ایک اعتبار سے طبقۂ اوّل کے فارسی شعرا کی مخلوق تھے لیکن اپنے عہد کے نامساعد حالات سے مجبور رہے۔ فکر و آگہی کا ابلاغ ان کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن اس کی صورت صوفیانہ ہے۔ یہ حضرات اپنے عہد کو درد و الم اور بے ثباتیِ دنیا کے احساس سے زیادہ کچھ نہ دے سکے اور اس سے زیادہ دے بھی نہ سکتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے گفتگو کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدّتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے نو بہار تو ہم سے
چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

(مرزا مظہر جانِ جاناں)

بے ہوش مے عشق ہوں کیا میرا بھروسا
آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا
صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

(میر تقی میر)

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا
اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے یارو
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا
ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو گئے

(سودا)

حجابِ رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا
محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

اردو شعرا کا دوسرا طبقہ فارسی شعرا کے دوسرے طبقے سے متاثر

ہوا۔ ان کی شاعری پر پیاز کے چھلکوں کی مثل صادق آتی ہے۔ ناسخ، شاہ نصیر اور ذوق زبان کے چکر میں اس طرح پڑے کہ شاعری اور اس کے تقاضوں کو نباہ نہ سکے۔ ان کی شاعری لفظی بازی گری اور فنی بے اعتدالی کے سوا کچھ نہ دے سکی۔ آج بھی ان کے اشعار پڑھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ اگر استادی ایسے ہی شعر کہنے کا نام ہے تو شاعری کو بے کیف بنانا کسے کہتے ہیں۔ ان کا مخصوص رنگ یہ ہے:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

جائے کافورِ سحر چاہیے کافورِ حنوط
یہ شبِ ہجر ہے یارو شبِ دیجور نہیں

ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
(ناسخ)

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

دیکھ لیتی جو اٹھا کر تو ترے لوٹتے ہاتھ
لیلا اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی
سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو (شاہ نصیر)

رخصت اے زنداں، جنوں زنجیرِ در کھڑکاتا ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلاتا ہے

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
دیکھو! چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
کہے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

(ذوقؔ)

غالب جب دنیائے شاعری میں گامزن ہوئے تو دونوں طبقے کے فارسی اور اردو شعرا کی روایات ان کے سامنے تھیں۔ وہ چاہتے تو کسی بھی طبقے کے شعرا میں اپنا نام لکھا دیتے اور ساری عمر ایسی راگنی الاپتے کہ ہمیں اور آپ کو پنبہ درگوش ہونا پڑتا۔ لیکن یہ امر ان کی سلامتیٔ طبع کے مانع تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے دونوں قسم کی روایات سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے متاخرین شعرائے فارسی کے فن اور تعبیراتِ فن کو جسے ناسخ کی مہارت مکمل نہ کر سکی، تکمیل تک پہنچایا۔ اور بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "عظیم شاعری کے پُر جلال ایوان میں داخل ہوئے۔"

میرزا اور ان کے ہم عصر شعرا کے کلام میں (بہ استثنائے مومن خاں مومنؔ) جو بُعد اور فرق نظر آتا ہے وہ محض اسلوبِ بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ اختلاف اندازِ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ ذوقؔ اور ان کے متبعین شعر میں روزمرّہ کے استعمال اور محاورہ گوئی کو کمال تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر میں خیال، مضمون اور موضوع کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے منضاد میرزا شعر کو انسانی فطرت کا ترجمان

سمجھتے تھے اور اس کی ترویج و ترقّی کو انسانی ذہن کے نشو و نما کی مانند ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کی بالغ نظر شخصیّت نے محسوس کر لیا تھا کہ بدلتے ہوئے حالات جس شعر و ادب کا تقاضا کر رہے ہیں، ان کی تکمیل قافیہ پیمائی کی شاعری سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ماضی کے ثقافتی و تمدّنی ورثے سے بہرہ یاب ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر قدیم و جدید روایاتِ شاعری کا دل فریب مرقّع پیش کرتی ہیں، اور اسی فنی عظمت کی بنا پر ان کے تنقید نگار انھیں مغلیہ تہذیب کا ترجمان اور قدیم و جدید شاعری کا نقطۂ اتّصال تسلیم کرتے ہیں۔

اس اصول کی روشنی میں جب ہم اپنے عہد کے ادبی رجحانات اور اس کی ترقی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتِ حال امید افزا نظر نہیں آتی۔ اس خیال سے بعض حضرات کو اتفاق نہ ہو لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہم اپنے ثقافتی و ادبی ورثے سے، جو ہم کو غالب، مومن، حالی، شبلی، سر سیّد، اکبر اور اقبال جیسے باکمال جانشینانِ سلف کے توسط سے ملا ہے، انصاف نہیں کر سکتے ہیں ہماری اس طرزِ روش پر ان اسلاف کی روحیں: جنھوں نے برِّ صغیر کے چمنِ ادب کی آبیاری کی ہے، شکوہ سنج ہوں تو ہمارے پاس اس کا جواب سوائے ندامت و شرمندگی کے کیا ہو سکتا ہے؟ ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم اپنی غفلت و کوتاہی کے ان اسباب کو پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کی جانب اس دورِ افراط و تفریط میں کم توجہ دی گئی ہے اور جو ہمارے عہد کے اہم ترین ادبی مسائل سے متعلق ہیں۔

گزشتہ اوراق میں عرض کیا گیا ہے کہ میرزا کی شخصیّت کی ایک

نمایاں خصوصیت جو انھیں اپنے عہد کے شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے اس تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی بنیاد پر جو اسلاف سے ملا، اپنے فن کی تعمیر و تشکیل اس نہج پر کی کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ اس تخلیقی عمل کے توسط سے انھوں نے ماضی و مستقبل کے مطالبات کا وہ حق ادا کیا جو ایک عظیم اور توانا فن کار کرتا ہے جسے اپنے ماضی سے ایسا ہی روحانی و ذہنی تعلق ہو، جیسا وہ مستقبل سے پیدا کرتا ہے۔ اس روایت کو مولانا حالی، شبلی، سرسید، اکبر اور اقبال نے (بہ حیثیت ادیب و شاعر) اپنے اپنے انفرادی رنگ میں برقرار رکھا اور آگے بڑھایا۔ ان حضرات نے اپنی علمی و ادبی تصانیف میں برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے اس ترغیب کے ساتھ روشناس کرایا کہ اگر وہ آج کی دنیا میں من حیث القوم اپنی حیثیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو قدیم و جدید روایات و تصورات میں اعتدال پیدا کریں[1] یہ مطالبات و مسائل بدستور قائم ہیں۔ آج بھی "ستیزہ گاہِ جہاں" وہی ہے اور "حریفِ پنجہ فگن" بھی وہی ہیں۔

---

[1] سرسید مرحوم نے اسی نہج پر تعلیمی میدان میں اپنے جوہر آشکار کیے اور اگر غور کیا جائے تو وہ تربیتی ادارہ جسے انھوں نے قائم کیا، برصغیر کے مسلمانوں کی علمی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی ادارے سے ایسے مردانِ حُر میدانِ عمل میں آئے ہیں جن پر نہ صرف برصغیر کے مسلمان بلکہ پوری دنیا کے زندہ و آزاد انسان فخر کر سکتے ہیں۔

آج بھی روحانیت و اخلاق سے عاری نظریاتِ زندگی کے عفریت اسلامی نظریۂ حیات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے در پے ہیں۔ ہماری نژادِ نو اپنی روایات اور عہدِ رفتہ کے تہذیبی کارناموں سے جس طرح غفلت اختیار کر رہی ہے اور مادیت کے گرداب میں پھنس کر بے بس ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ہماری تشکیلِ جدید کے لیے لمحاتِ فکر ہیں لیکن بہت کم اہلِ نظر اس جانب متوجہ ہیں۔ اس کے برخلاف صحافتی تفریحی ادب تمام توجہات کو منعطف کر رہا ہے۔ ان حالات میں ہمارے ادیبوں کو زندگی کی مستقل اقدار کی نمایندگی اور ترجمانی کی ذمے داری قبول کرنی چاہیے جو ان پر بہ حیثیت ادیب و فن کار عاید ہوتی ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کا تتمہ یہ ہے کہ فرد یا قوم کی ترقی کے آئین اور اصولوں میں ایک آئین اور اصول یہ ہے کہ وہ ماضی کے تہذیبی اثرات کو حال کے قالب میں اس طرح ڈھالیں کہ کوئی اثر ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب غیر مفید اثرات کو ترک کیا جائے اور ان کی جگہ مفید اور صحت مند عناصر کو قبول کیا جائے۔ میرزا کی ذہنی و ادبی زندگی میں اس اصول کی کارفرمائی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جس کا خود ان کو بھی احساس ہے اور یہی احساس ان کو انانیت کی منزل میں لے جاتا ہے جو یقینی طور پر ایک فن کار کی زندگی کا امتیازِ خاص ہے:

نہ رنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالبؔ
بہ دار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا

---

# احباب اور قرابت داروں سے خلوص

عام قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی عظیم فن کار کی زندگی سے کوئی اثر لیتے ہیں تو قدرتی طور پر یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری محبوب شخصیت کے دوست، احباب اور قریبی عزیز کون تھے اور اس کے تعلقات ان لوگوں سے کس نوعیت کے تھے۔ یہ سب کچھ ہم اس لیے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ معاشرتی زندگی میں تعلقات اور مراسم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی شخص کی ذاتی عظمت اور زندگی کی رفعت کو اس معیار سے جانچا جا سکتا ہے کہ احباب سے اس کا خلوص کس درجہ تھا اور قرابت داروں کے باب میں اس کے احساسات و عمل کیا تھے؟ اگر کسی شخص کا رویّہ عزیزوں اور دوستوں کے لیے راحت فزا نہیں ہے تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص بہ اعتبارِ اخلاق و اصول معاشرت کامل نہیں ہے۔ ہماری تہذیب و معاشرت میں ایسے شخص کو جس کا طرزِ عمل احباب و قرابت داروں کے لیے اندوہ ربا اور تسکین و طمانیت کا باعث ہو، اس شخص سے زیادہ معزّز و محترم تسلیم کیا گیا ہے جس کا طریق دل آزاری ہو۔ اس اصولِ اخلاق کی اہمیّت کا اظہار ہر دَور کے شاعر کرتے رہے ہیں :

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

تو کز محنتِ دیگراں بے غمی
نہ شاید کہ نامت نہند آدمی

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

آہستہ سے چل میانِ کہسار
ہر سنگ دکان شیشہ گر ہے

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ہم اس مضمون کی ابتدا میں واضح کر چکے ہیں کہ میرزا صاحب کی زندگی اور شخصیّت کسی فوقِ لبشر کی شخصیّت اور زندگی نہیں ہے جو خوارقِ عادات کے واقعات سے معمور ہو۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ ایک دنیادار انسان تھے، اسی اعتبار سے ان کی شخصیّت و کردار کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس بحث میں ہمارے پیشِ نظر دو امور ہیں۔ ایک یہ کہ میرزا کے ذاتی اور پرائیویٹ تعلقات اپنے احباب اور قرابت داروں سے کس نوعیّت کے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس پہلو نے ان کی شخصیّت، شاعری، اور فن پر کیا اثر مرتّب کیا۔

کسی شخص کی ذاتی اور نجی زندگی کے مطالعہ میں دو قسم کی شہادتیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک وہ شہادت جو خارجی ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس شہادت کی رُو سے معلوم کیا جاتا ہے کہ شخصِ متعلّقہ کے بارے میں

اس کے دوست، احباب اور قریبی عزیزوں کے کیا خیالات تھے۔ اس ذریعے سے حاصل کی ہوئی معلومات کو خارجی شہادت کہتے ہیں۔ دوسری شہادت کا ذریعہ شخص متعلقہ کی ذاتی تحریرات، تصانیف اور زندگی سے متعلق شعوری یا غیر شعوری خیالات ہوتے ہیں اسے داخلی شہادت کہتے ہیں۔

میرزا کی نجی زندگی سے متعلق خارجی و داخلی، دونوں قسم کی شہادتیں دستیاب ہیں۔ خارجی شہادتوں میں ان کے تلامذہ کی تحریروں کے علاوہ سب سے اہم شہادت حالی کی "یادگارِ غالب" ہے یا مولوی گل حسن کی "تذکرۂ غوثیہ" کا وہ اقتباس ہے جس میں حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی نے اپنی ذات سے متعلق غالبؔ کے طرزِ عمل اور رجب علی بیگ سرورؔ کی غالب سے ملاقات، 'فسانۂ عجائب' پر تنقید اور سرورؔ کی دل جوئی کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یادگار کے اندراجات کو دانستہ ترک کر رہے ہیں۔ یہ خیالات ایک عقیدت مند شاگرد نے جذبۂ عقیدت سے معمور ہو کر پیش کیے ہیں جن پر کافی جرح و تنقید ہو چکی ہے اور اس خصوص میں مزید جرح و تعدیل کے امکانات ہیں۔ البتہ "تذکرۂ غوثیہ" سے وہ اقتباس پیش کیا جائے گا جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ داخلی شہادت کے سلسلے میں میرزا صاحب کے اردو فارسی خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے تلامذہ' احباب' اور قریبی عزیزوں اور دیگر حضرات کو تحریر کیے تھے۔ غالب کی شخصیت و کردار کے مطالعے میں سب سے زیادہ مستند اور قابلِ قبول یہی مواد ہے۔

"تذکرۂ غوثیہ" کا اقتباس ہے:

" ایک روز ہم میرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لبِ فرش تک آکر لے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ میرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو، کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا۔ صاحب یہ شعر تو میرا نہیں، کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے[1] اس دن سے میرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجیے۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مےخوار، رُوسیاہ، گناہ گار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اُدلش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسرِ نفسی اور فروتنی تھی۔

---

[1] اس سطر کے بعد "غزل میرزا نوشہ" کے عنوان سے وہ غزل تحریر ہے جس کا مطلع ہے: عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
ہم نے طوالت کے خیال سے اس غزل کو چھوڑ دیا ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میرزا رجب علی مصنف
'فسانۂ عجائب' لکھنؤ سے آئے۔ میرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے
گفتگو میں پوچھا۔ میرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ
ہے؟ کہا، چہار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے — اور
فسانۂ عجائب کیسی ہے؟ میرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ اجی
لاحول ولاقوۃ، اس میں لطفِ زباں کہاں۔ ایک تک بندی
اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ
خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال
معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا، ظالمو پہلے سے
کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن میرزا نوشہ ہمارے پاس آئے
یہ قصہ سنایا اور کہا۔ حضرت یہ امر ہم سے نادانستگی
میں ہو گیا۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات
کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ
پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد میرزا صاحب نے عبارت آرائی
کا ذکر چھیڑ دیا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ جناب
مولوی صاحب، رات میں نے فسانہ عجائب کو بہ غور
دیکھا تو اُس کی خوبیِ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں'
نہایت فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی
عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی، اور کیوں کر ہو، اس
کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت
سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے

میاں سرور کو بہت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ میرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے۔ اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔" [1]

جن حضرات نے تذکرۂ غوثیہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ حضرت غوث علی شاہ صاحب کی اس بے لاگ تنقید سے واقف ہوں گے جو انھوں نے ریاکار صوفیوں، شعبدہ باز سنیاسیوں اور جوگیوں پر کی ہے۔ شاہ صاحب نے غالب کی جو تصویر پیش کی ہے اس پر مزید تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ غالب کے حسنِ اخلاق، بے ریائی، تواضع اور دل جوئی کا آئینہ دار ہے۔

میرزا کے اردو خطوط کی تعداد جو مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیے ہیں، تقریباً ساڑھے چھ سو ہے اور جن حضرات کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں، وہ نوے افراد ہیں۔ ان تمام خطوط کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس حقیقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ میرزا صاحب کو اپنے مکتوب الیہ کا کتنا پاسِ خاطر تھا اور وہ اپنے اعزّا اور احباب سے کس درجہ مخلص تھے۔ ان تمام خطوط میں کہیں بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ انھوں نے فلاں مقام پر مکتوب الیہ کے دل کو ملول و رنجیدہ کیا ہے۔ حالی نے غالب کے مرثیے میں ان کی اسی صفت کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

---

[1] تذکرۂ غوثیہ۔ ص ۱۰۰ پنجاب پبلک لائبریری۔ بحوالہ غالب نامہ شیخ محمد اکرام

بے ریائی تھی نہ زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

یہ بے ریائی کبھی مزاج و ظرافت کے روپ میں، کبھی غم گساری و دل جوئی کی شکل میں، کبھی تسکین و دل نوازی کی صورت میں ان کے ظاہری اعمال اور باطنی کیفیات سے عیاں ہوتی ہے اور ان سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ شاید رشید صاحب کو غالب کی یہی ادا پسند ہو اور اسی پسندیدگی کی بنا پر انھوں نے غالب سے دوستی کرنے کی تمنّا کی ہو۔ بہر حال رشید صاحب کی پسندیدگی کا سبب کچھ بھی ہو لیکن ان کے احباب قطعی طور پر ان کے رشتۂ خلوص تھے۔ نوّاب امین الدّین احمد خاں کے نام ایک خط میں جس خلوص کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس کے اک اک لفظ سے نمایاں ہے، اور ممکن نہیں کہ مکتوب الیہ کا دل اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر رہا ہو۔

"ساٹھ برس سے ہمارے تمھارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ سچ کا میرا تمھارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے میں تم کو چاہتا ہوں۔ بے اس کے کہ چاہت تمھاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبّت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمھیں چاہتا رہا تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے۔ وہ قرابت اور مودّت کیا پیوندخوں سے کم ہے؟ تمھارا حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں"

نواب صاحب بہ سبب علاج دہلی آئے ہیں - ان کے صاحبزادے
علاء الدین احمد خاں کا خط پہنچتا ہے کہ والد صاحب کے علاج میں توجہ کریں،
اور کسی طبیب حاذق سے رجوع کریں - ان کو تحریر کرتے ہیں :

"سبحان اللہ تم مجھ سے سپارش کرو امین الدین خاں
کی ؟ کیا میرے پہلو میں دل یا میرے دل میں ایمان جیسے محبت
بھی کہتے ہیں، بقدر پریشتہ و سرمور بھی نہیں ؟ معالجہ حکما
کی راہ پر رہے گا - ندیمی اور غم خواری میں اگر قصور کروں تو
گناہ گار"

یہ خطوط تو ان لوگوں کو لکھے گئے ہیں جن کی میرزا سے قرابت داری اور
عزیزداری تھی اور جن کے لیے میرزا کے دل میں اخلاص کا پیدا ہونا فطری
تھا لیکن ان سے تعلق رکھنے والے ایسے بھی لوگ تھے جو مذہبی و دینی
یگانگت بھی نہ رکھتے تھے - ان کے لیے بھی میرزا کی بے غرض دردمندی
اور پرخلوص تمنّائیں اسی قدر تھیں جس قدر اپنوں کے لیے - ایک خط مثال
کے طور پر پیش ہے -

میرزا صاحب کو مہاراجا بھرت پور کے انتقال کی خبر ملی ہے - وہ
صرف اس وجہ سے پریشان ہیں کہ ہر گوپال تفتہ جو جانی جی کے علاقے میں ہیں
کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو جائیں - جانی جی ریاست کے وکیلوں میں سے
تھے اور والیِ ریاست کے انتقال کے بعد جو کچھ ریاستوں کے انتظامیہ
میں ردّ و بدل ہوتا تھا، اس سے میرزا بخوبی واقف تھے، لکھتے ہیں :

" آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال
سراسیمگی میں لکھتا ہوں - جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت

ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو، اور اگر
وقت نہ رہا ہو تو چار و ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔
منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجا
بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی۔ کل سے اور
بڑی خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو یقین
ہے کہ تم کو تحقیقی حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت
ہے؟ راجا کا مجھ کو غم نہیں۔ مجھ کو فکر جانی جی کی ہے تم بھی
اسی علاقہ میں شامل ہو۔"

اسی خط میں تحریر کرتے ہیں:

"اور جو صورت ہو مجھ کو لکھو اور جلد کہ مجھ پر خواب و
خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سُنا۔ آج صبح قلعہ نہیں گیا۔
اور یہ خط از راہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے، تم بھی اس
کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔"

غور کیا جائے تو یہ اضطراب اور بے چینی میرزا صاحب کے اس جذبہ
خیر طلبی کی آئینہ دار ہے کہ اس ہنگامے میں ان کے عزیز شاگرد کو کسی قسم
کی تکلیف پیش نہ آئے۔ پھر یہ جذبۂ خیر طلبی دنیا سازی اور دکھاوے کے
لیے نہیں ہے بلکہ اس جذبے کے پسِ پردہ وہ بے ریا شخصیت کارفرما ہے
جس کا اعتراف حالی نے اپنے مشہور مرثیے میں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرزا ایک دردمند دل اپنے پہلو میں رکھتے تھے
اور ان کی زندگی جس طرح غم و آلامِ روزگار سے دوچار رہی۔ اس کا لازمی
نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے متعلقین کے رنج والم کو اپنا رنج والم سمجھ لیں۔ یہی

وجہ ہے کہ جب کبھی کسی عزیز کی تکلیف و پریشانی کا ان کو علم ہوتا تھا تو مضطرب ہو جاتے تھے۔ اور یہ اضطراب اس وقت تک برقرار رہتا تھا، جب تک اس پریشانی اور تکلیف کے دور ہونے کی اطّلاع نہ ہو جائے۔ ان کے کردار میں یہ درد مندی اور غم گساری احباب اور عزیزوں کے لیے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ ان کے دل میں عام انسانوں کے لیے بھی جذبہ کارفرما تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے کلام اور خطوط میں جابجا کیا ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

ایک خط میں نواب علاءالدّین خاں کو تحریر کرتے ہیں:

"قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ان میں سے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں ایک شطرنجی اور ٹین کا لوٹا مع سُوت کی ایک رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا کبھی مصر جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ سہی جس شہر میں رہوں اس میں بھوکا ننگا نظر نہ آئے خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت

میں گرفتار میرے اور معاملاتِ کلام وکمال سے قطع نظر کرو۔
وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک
مانگے، وہ میں ہوں۔"

اس خط میں عام انسانوں کے لیے جن دردمندانہ جذبات کا اظہار میرزا نے کیا ہے وہ نہ صرف غور طلب ہے بلکہ ہمارے ملک کے اہلِ قلم حضرات اور فن کاروں کے لیے درسِ ترغیب ہے جس پر عمل کیے بغیر کوئی فن کار اور ادیب صحیح معنوں میں جاذبِ توجہ نہیں بن سکتا۔

کس نمی نالد از فسانۂ من
دردِ دل را بیاں نمی خواہم
ہیچ کس سودِ من نمی خواہد
ہیچ کس را زیاں نمی خواہم
خستۂ چشم زخم خویشتنم
ناد کے بر نشاں نمی خواہم
خو بہ بیداد کردہ ام غالب
عیدِ نوشیرواں نمی خواہم

---

# انسانی نقطۂ نظر سے مسائلِ حیات کا مشاہدہ

غالب مسائلِ حیات کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا حل بھی انسانی استعداد اور صلاحیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے سوچتے تھے۔ ان کے کلام میں جن مقامات پر حکیمانہ نکات اور انسانی زندگی کے اسرار و رموز بیان ہوئے ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد منکشف ہوتا ہے کہ ان کے مشاہدات و تجربات میں کوئی بات ماورائے بشریت نہیں ہے۔ وہ ہماری طرح کے ایک انسان ہیں۔ گوشت پوست رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں اچھی زندگی بسر کرنے کی تمنّائیں کروٹیں لیتی ہیں۔ وہ اپنی صلاحیّت اور استعداد سے بخوبی آگاہ ہیں اور اجتماعی زندگی میں قابلِ وقعت مقام حاصل کرنے کے طلب گار ہیں۔ ان کے کلام سے قطعِ نظر جو اہلِ ذوق کی روحانی و وجدانی تسکین کا بے بہا سرمایہ ہے۔ اگر ہم ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو بھی ان کی زندگی کا ہر واقعہ اور بہتر زندگی کے لیے سعی و طلب انھیں ایک مثالی انسان ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

سوانحی حالات کے مطابق میرزا کی عملی زندگی کی ابتدا آگرہ کی ترکِ سکونت سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے سے دمِ واپسیں تک انھوں نے مشکلات و مصائب کا جس دلیری سے مقابلہ کیا اور جس ذوق و شوق سے زندگی کی نعمتوں کے حصول کے لیے جدّوجہد کی ان

کی تفصیلات تذکرہ نگاروں نے تمام و کمال قلم بند کر دی ہیں اور ان سب پر مستزاد گراں بہا خطوط کا مجموعہ ہے جس کی موجودگی میں کسی خارجی شہادت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ سے جاگیر اور حقِ وراثت پر نزاع اور اس نزاع کے سلسلے میں سفرِ کلکتہ، قاطع برہان کے معاملے میں اپنے نقطہ نظر کا بے باکانہ اظہار، دربارِ شاہی میں رسائی کا اشتیاق اور زمانۂ غدر میں پورے ثبات و یقین کے ساتھ دہلی کا قیام، یہ سب واقعات اگر ایک جانب میرزا صاحب کی عالی ہمتی کی نشان دہی کرتے ہیں تو دوسری جانب تقاضائے بشریت کا اظہار ہیں جن کے بغیر انسان کی زندگی میں بے شمار جھول نظر آتے ہیں۔

میرزا صاحب کی شخصیّت کے مطالعے کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جس قدر عظیم فن کار اور اربابِ کمال گزرے ہیں ان میں سے بیشتر کی زندگی اور فن میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فن کار اپنی شخصیّت و کردار کے کمزور پہلوؤں کو جنھیں زمانے کی معاشرت، اخلاقی قدروں کے منافی خیال کرتی ہے، لوگوں کی نگاہوں سے نہاں رکھنا چاہتا ہے۔ شعوری طور پر فن کار کی یہ کوشش اس جذبے کے تحت جاری رہتی ہے کہ جس فن پارے کو وہ اہلِ ذوق کی "لذتِ کام و دہن" کے لیے پیش کر رہا ہے اس کی دل کشی و رعنائی میں فرق نہ آنے پائے اور وہ "طلسمِ سیمیائی" جو اس نے اپنی تخلیق کے گرد اگرد پیدا کیا ہے، وہ معدوم نہ ہو جائے۔ قطعِ نظر اس بحث کے کہ فن کار اس قسم کے فریب پیدا کرنے میں حق بجانب ہے یا

نہیں؟ اور یہ کہ اس تخلیقی عمل کے اسباب و علل کیا ہیں؟ ادب و فن کی دنیا میں یہ حقیقت متفقہ طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ یہی فرار و گریز عظیم تخلیقات کو عالمِ وجود میں لاتا ہے۔ اس تجزیے کے باوصف جب کبھی فن کار کی شخصیت اور فن کا تضاد ظاہر ہوتا ہے تو ہماری نگاہ میں فن کی وقعت اگرچہ باقی رہتی ہے لیکن فن کار کی اہمیت ضرور کم ہو جاتی ہے۔

میرزا کے باب میں اس قسم کے احتمال کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ کوئی محقق یا نقاد ان کی شخصیت اور فن میں تضاد محسوس کرے۔ یہ اس لیے کہ وہ اپنی بشریت اور احساسِ بشریت کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ مشرقی شعرا اور فن کاروں کے عام اندازِ فکر کے متضاد وہ انتہائی جرات کے ساتھ اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک فارسی شعر میں اپنی بشریت کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیاں می زنم

سعدی نے بھی چند مقامات پر ایسی ہی جرأت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر
کیں گنا ہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند
ہیچ کس بے دامنِ تر نیست اما دیگراں
باز می پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

لیکن اہلِ نظر غور فرمائیں۔ میرزا کا اعتراف ان کی افتادِ طبع کا برملا اظہار ہے برخلاف اس کے سعدی اظہارِ خطا میں جرأت تو کرتے ہیں لیکن دوسروں کو

بھی خطاوار ٹھہراتے ہیں اور سخن کے پردے میں اپنی بریت کی صفائی پیش کرتے ہیں۔

میرزا نے دوسرے مقامات پر بھی اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہاں بھی ان کو جو کچھ عیب نظر آتے ہیں، اپنی ہی ذات میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ عام انسانوں کی حالت ان ہی جیسی ہو۔ میرزا کے اندازِ فکر میں یہ جرأت اس سبب سے ہے کہ وہ استنباطِ نتائج اور تجزیے میں کسی قسم کے التباس کو روا نہیں رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت میں اس تصنع اور فرار کا قطعی فقدان تھا جو مسائلِ زندگی کو حقیقت کی بجائے معمّا بنا دیتے ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

ہنگامۂ زبونیِ ہمّت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کہا جا سکتا ہے کہ میرزا نے اپنے اردو فارسی کلام میں جن جذبات و کیفیات کا اظہار کیا ہے ان میں بڑی حد تک تخالف و تضاد پایا جاتا ہے اور کیا یہ تضاد

اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ مرزا کی ذہنی اور نفسی کیفیتوں میں وہ اعتدال و توازن کارفرما نہیں تھا جس سے ایک مثالی شخصیت کے تار و پود بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک طرف انسانی عظمت منتہائے کمال پر متمکن نظر آتی ہے تو دوسری جانب انتہائی پستی کے احساسات کا ترشح ہوتا ہے:

پہلی مثال:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

بہ وادی کہ دراں خضر را عصا خفت ست
بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت ست

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نہ تواں گفت

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

دوسری مثال:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

یہ اعتراض کافی اہم ہے اور جدید تنقید کے اصولوں کی روشنی میں تفصیل سے وضاحت کا محتاج ہے، اس لیے کہ نہ صرف میرزا کے معاملے میں اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے بلکہ دنیا کے اکثر مشاہیر شعرا جو جاذب توجہ شخصیت کے حامل ہیں، اس ظن و تخمین کا شکار ہو سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شخصیت و کردار کی پیمایش کا فن بھی سائنسی علوم کے مانند ایک نازک فن ہے اور جس طرح ذرا سی غفلت و بے توجہی سے کوئی کیمیائی تجزیہ اور طبیعیاتی مشاہدہ بے سود ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح شخصیت کی تنقید کے سنجیدہ اور متوازن اصولوں سے 'بے احتیاطی' غیر مفید تجزیے کا باعث ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید جو غیر متوازن اصولوں پر مبنی ہو، ناقد کے ذہنی میلانات کی تسکین کا ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن خود تنقید کے فن کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور تنقید نگار سے جس علمی و ادبی خدمات سرانجام دینے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کا تکمیل پانا محال ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شخصیت کی پیمایش کا فن اگرچہ سائنسی علوم کی طرح نازک اور لطیف ضرور ہے لیکن یہ کوئی سائنسی تجزیہ نہیں ہے جس میں مادّوں کے خواص اپنی حالتوں سے سر مو تجاوز نہیں کرتے اور ان سے وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ان کی ساخت اور تخلیق میں ودیعت ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے شخصیت کی تنقید قطعی طور پر ایک ذہنی و وجدانی عمل ہے جس کے نتائج بہت کچھ

پاسبانِ عقل سے تنہا رہ کر سمجھے اور پرکھے جاتے ہیں۔

اس موضوع پر پروفیسر آلِ احمد سرور نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس کا اعادہ نامناسب نہ ہوگا۔

"کسی شاعر کی شخصیّت کا مطالعہ اس کے کلام سے کرنے کے لیے ماہرِ نفسیات ہونا کافی نہیں۔ شاعری کے آداب سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں شخصیّت کی خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کی نوعیت بتاتا ہے۔ اس کے میلان یا جھکاؤ سے واقف کرتا ہے۔ مگر شاعری جس طرح شخصیّت کو ظاہر کرتی ہے، وہ اس کا اپنا طریقہ ہے۔ یہ ایک طلسمی دنیا ہے جس میں کہیں بہت تیز روشنی اور کہیں بہت گہری تاریکی ہے۔ یہاں آوازیں حقیقی ہیں، ملی جلی ہیں۔ ہر آواز شاعر کی نہیں ہے اور کوئی آواز شاعر کی لَے سے محروم نہیں ہے۔ شاعر کی آواز میں بھی بہت سی پچھلی آوازوں کی گونج ہے۔[۱]

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

"اس لیے شاعری میں شخصیّت کا مطالعہ خاصا دلچسپ اور مفید مگر مشکل کام ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے شاعری کی آوازوں سے مانوس ہونے کی ضرورت ہے۔ شاعری کی فضا سے آشنا ہونا۔ شاعر سے ذہنی ہمدردی

---

[۱] - شاعری میں شخصیّت علی گڑھ میگزین شمارہ (۱) ۱۹۵۶ء

پیدا کرنا تحسین کے فرائض سے عہدہ بر آ ہونا شاعری کی اپنی حقیقت اور اس کے اپنے قواعد کا جاننا ضروری ہے۔"[1]

اس لحاظ سے کسی شاعر کے کلام سے اس کی شخصیت کو جانچنے کے لیے وہ لگے بندھے اصول کام میں نہیں لائے جا سکتے جو ریاضی اور اقلیدس کے مسائل کو حل کرتے میں مستعمل ہوتے ہیں اس لیے کہ شاعر جہاں اپنی ذہنی حالت اور مزاج کا ترجمان ہوتا ہے وہیں دوسروں کی ذہنی افتاد کو اپنی ذات سے متعلق بھی کر لیتا ہے۔ ایسی صورت میں شخصیت کی پیمائش کرنے والے پر حزم و احتیاط سے کام لینا زیرِ تجزیہ شخصیت کے لیے بھی مفید ہوتا ہے اور ان کے لیے بھی جن سے شخصیت متعارف کی جا رہی ہے۔

شخصیت کی پیمائش کے سلسلے میں جو اصول پیش کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ صفحات مذکورہ میں جو پہلی مثال اشعار کی سامنے آئی ہے اس سے میرزا صاحب کے شخصی اور ذہنی میلانات ترشح ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اندازِ فکر ان کے کلام اور خطوط میں نبضِ حیات کی مانند رواں دواں ہے۔ ان کے ہاں اسی قسم کے خیالات و رجحانات کی کثرت ہے۔ اشعار کی دوسری مثال اپنے عہد کے خوش باش اور خوش فکر طبقے کے میلانات کی نمایندہ ہے جن کو میرزا صاحب نے اپنی ذات سے متعلق کر لیا ہے۔ ایسے موقع پر میرزا صاحب تو کیا کسی بھی ثقہ اور متدین بزرگ کے ہاتھ پاؤں پھول سکتے ہیں۔ اور گالیوں کا جواب بھی وہ ہی دعائیں ہوں گی جو صرفِ دریاں ہو جائیں۔ اس مقام پر بھی میرزا صاحب

---

[1] شاعری میں شخصیت۔ علی گڑھ میگزین، شمارہ (۱) - ۱۹۵۶ء

نے فطری حالات و نتائج سے گریز کرنے کی بجائے حقیقتِ نفس الامری کو پیشِ نظر رکھا ہے ۔ یہ حقیقت طرازی اور واقعیت پسندی اس وقت ممکن ہے جب شخصیّت طلسماتی دنیا سے عالمِ ارض کی جانب صعود کرتی ہے لیکن :

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام است

غالب نے ایک جگہ کہا ہے :

رازِ دانِ خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں می زنم

لیکن ان کی حقیقت پسندی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ "دانا و ناداں" کو دیکھ کر زیرِ لب تبسّم کرتے ہیں ، اپنے آپ پر بھی قہقہہ مار کر ہنستے ہیں ۔ اس تمسخر و تضحیک میں ایک عظمت ، ایک عالی ہمتی ہے ۔ ہماری آپ کی دُنیا میں ایسے عالی حوصلہ افراد بہت کم نظر آتے ہیں جو اپنی ذات اور اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرتے ہیں ، ورنہ انسانوں کا عام گروہ دوسروں کی عیب جوئی اور اس کے اظہار میں ہمیشہ سے دلیر رہا ہے ۔ اگرچہ یہ طریقِ فکر پراگندگیٔ نفس اور انتشارِ ذہنی کی علامت ہے ۔ لیکن ہم میں سے اکثر ان بدیہات سے چشم پوشی اور اغماض کر جاتے ہیں ۔ غالب جہاں اہلِ دنیا کے غلطی ہائے مضامین کی بات کرتے ہیں ، خود کو بھی نہیں بخشتے :

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبہ کس منھ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

ان کے خطوط میں اپنی ذات پر تبصرے کی لے اور شدید ہو گئی ہے اس لے کی شدت کچھ ان کو "طریقِ ملامتیہ" کی حدود میں لے جاتی ہے۔ قربان علی بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کو ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا کافر مرا۔ ہم کہ از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنّت آرام گاہ اور عرش نشیمن، خطاب دیتے ہیں۔ چوں کہ یہ اپنے کو شہنشاہِ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" "زاویہ ہاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدّولہ بہادر" ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔" اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو بولو کچھ تو اکسو۔" بولے کیا

بے حیا، بے غیرت کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب،
بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام قرض
لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا تھا کہ کہاں سے دوں گا؟" ؎
کہتے ہیں کہ ہنسی کی انتہائی آواز آہ و کراہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
اس خط میں میرزا صاحب خود پر ایسے بے تحاشہ ہنسے ہیں کہ قہقہہ
گریہ بن گیا ہے۔ شاید اسی حقیقت نے ان سے یہ شعر کہلوایا ہے:

گریہ را در دل نشاطِ دیگر است
خندہ بر لب ہائے خنداں می زنم

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بصیرت اس کارگہِ حیات میں ہر واقعہ
اور افتاد سے باخبر اور نگراں گزرتے ہیں۔ کائنات ان کی نگاہ میں کفِ
دست کے مانند کھلی ہوئی اور عیاں ہوتی ہے۔ وہ ہر شے کا مطالعہ
دانش و بینش کی روشنی میں کرتے ہیں اور استنباطِ نتائج میں کبھی
دھوکا نہیں کھاتے۔ ان کی آنکھیں ماضی، حال اور مستقبل کو بیک
وقت رقصاں و درخشاں دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات و
تصوّرات انسانی بصیرت و سعی کی حد تک بے گمانہ صداقت نہیں
ہوتے۔ اسی صداقت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میرزا صاحب نے کہا ہے:

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبضِ تپاں در رگِ صحرا بینند

ان کی شخصیّت کا ایک صحت مند اور توانا پہلو یہی رگِ صحرا بیں

---

؎ خطوطِ غالب از مولانا مہر۔ ص ۱۱۱

جادہ کو نبضِ تپاں کے مانند دیکھتا ہے۔ انھوں نے مسائل حیات کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے حل کرنے کی جدّ و جہد کی ہے۔ یہ سعی و جہد ان کی پوری زندگی میں کارفرما نظر آتی ہے :

خونِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

یہ آغشتگیِ خون حقیقت طراز بھی ہے اور حقیقت نما بھی۔ اور جب افراد اس قربانی سے گریز اور اغماض کرتے ہیں تو انھیں محرومی و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

---

# غالب اور ظرافت

مولانا حالی نے غالب کو "حیوانِ ظریف" کہا ہے لیکن وہ اس سے بھی سوا کچھ اور تھے۔ غالب ہنستے ہنساتے ہی نہیں، ایسے نشتر بھی چبھوتے ہیں جن کی چبھن تیز اور شدید ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے غالب کی ظرافت اس ظرافت کے مماثل قرار نہیں دی جا سکتی جس کا مقصد ہنسنے ہنسانے کے سوا کچھ نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ہنسی کسی شے کے ناہموار اور بے تکا ہونے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس اصول کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ایک پاگل کی ہنسی اور عام انسان کی ہنسی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ دونوں ہی کسی نہ کسی بات کے بے ڈھنگے پن سے متاثر ہو کر ہنستے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی ہنسی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ پاگل اپنی ہنسی کے اسباب و محرکات سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی ہنسی ایک نفسیاتی مرض ہے، ایک مجبوری ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کی فہم سے بالاتر ہے۔ اس کے متضاد عام انسان کی ہنسی میں ایک خاص قسم کا شعور اور معقولیت موجود ہوتی ہے۔ اس کی ہنسی میں ناہموار باتوں کی تضحیک کا احساس ہوتا ہے۔ اسی احساس کی کمیت کے اعتبار سے ہنسی کے درجے متعین کیے گئے ہیں یہی

درجے ظرافت، مزاح، طنز یا ہجو کہلاتے ہیں۔ظرافت، مزاح اور طنز
ایک احتجاج ہے جو انسانی ضمیر میں حالات کی بے اعتدالی، ناہمواری،
اور ناانصافی کے خلاف پیدا ہوتا ہے۔یہ احتجاج ابتدائی درجے میں ظرافت
کہلاتا ہے۔ظرافت ناہموار باتوں کی تضحیک کا خام یا نامکمل احساس ہے۔
اسی لیے ادب میں ظرافت نگاروں کا رتبہ سطحی مانا گیا ہے۔مزاح ناہمواری
کے خلاف انسانی ضمیر کے احتجاج کا دوسرا درجہ ہے۔اس درجہ میں
احساس غیر سنجیدگی کے دائرے سے نکل کر سنجیدہ حدود میں داخل ہوتا
ہے۔مزاح نگار قہقہہ لگا کر نہیں ہنستا۔ اس کی ہنسی زیر لب ہی رہتی
ہے۔یہی متانت و سنجیدگی اسے ظرافت نگار سے بلند کرتی ہے، اور
اسی وجہ سے ادب میں مزاح نگار کا رتبہ ظرافت نگار کے مقابلے میں
زیادہ قابلِ لحاظ تسلیم کیا گیا ہے۔طنز یا ہجو میں تضحیک و احتجاج کا
احساس تیز اور شدید ہوتا ہے۔طنز نگار کی ہنسی تلخ اور کسیلی ہوتی ہے۔
اس کی ہنسی کے تیور تیکھے اور جھلاہٹ سے معمور ہوتے ہیں۔اس
اعتبار سے طنز یا ہجو کا استعمال "اگر یک سرِ موئے برتر پرم" کے مصداق
ہوتا ہے۔اگر طنز نگار نے اس منزل کو حسن و نفاست سے طے کر لیا تو اس کا
مقام ظرافت نگار اور مزاح نگار، دونوں سے بلند اور قابلِ وقعت ہو جاتا
ہے۔دوسری صورت میں اگر اس نے طنز نگاری کے فرائض پوری توجہ
اور فنی ضرورت کے ساتھ ادا نہیں کیے تو اس کا ادبی مقام مشتبہ اور
بے اثر رہ جائے گا۔

اس مقام پر اس امر کی وضاحت مناسب ہے کہ اگرچہ ظرافت،
مزاح اور طنز حالات کی بے اعتدالی ناانصافی اور ناہمواری کی تضحیک کے

احساس سے پیدا ہوتے ہیں لیکن اس تضحیک میں ہمدردی اور تعمیری تنقید کا پایا جانا از بس ضروری ہے۔ اگر کسی ادیب میں ہمدردی اور تعمیری جذبے کا فقدان ہے تو اس کے تبسم اور قہقہے کی قدر و قیمت تضحیک و تمسخر سے زیادہ متصوّر نہ ہوگی۔

ہمارے پیشِ نظر اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخی ترتیب اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کی تفصیلات نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ظرافت، مزاح اور طنز کا ادیب و فن کار کی شخصیت و کردار سے کیا تعلّق ہوتا ہے۔ کس نوعیّت کی تحریر اور اندازِ فکر شخصیت و کردار کو دلچسپ اور عظیم بناتے ہیں۔ غالب نے اس خصوص میں جو باتیں کہی ہیں یا تحریر کی ہیں ان کی بنیاد پر غالب کی شخصیت کس سطح پر متعیّن کی جا سکتی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہم جس انداز و معیار کی شخصیّت و کردار کے حامل ہوتے ہیں، اسی انداز و معیار کے مطابق سوچتے ہیں اور اسی نہج سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے فکر اور اس کے ابلاغ و ترسیل کا تعلّق ہماری شخصیّت و کردار سے بدیہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخصیّت و کردار، طرزِ فکر اور اس کے اظہار کا سرچشمہ ہیں۔ اگر شخصیّت و کردار اوسط درجے کے ہیں تو ان سے اوسط درجہ کے فکر و عمل کا اظہار ہوگا اور بلند درجے کے ہیں تو اظہارِ فکر و عمل بلند درجہ کا ہوگا۔ ظرافت، مزاح اور طنز بھی ایک طریقۂ فکر اور ابلاغِ فکر ہے جس کا تعلّق شخصیّت و کردار سے ناگزیر ہے جس انداز و معیار سے ادب میں اس طریقۂ فکر کا اظہار ہوگا

اسی نوعیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے شخصیّت وکردار کا تعیّن کیا جائے گا۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں میرزا صاحب کی شخصیّت وکردار کا مطالعہ دلچسپ اور توجّہ کے لائق ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا ہے۔ ظرافت، مزاح اور طنز، محض ہنسی اور قہقہے نہیں ہیں بلکہ زندگی کی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف تضحیک و احتجاج کے اسالیب ہیں جنھیں ہم زندگی پر تبصرہ کرنے کے انداز بھی کہہ سکتے ہیں۔ غالب کے کلام، لطیفے اور خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیّت میں تینوں اسالیبِ فکر کا حسین امتزاج تھا۔ وہ زندگی کے بے تکے پن پر قہقہے بھی لگاتے ہیں، زیرِلب تبسّم بھی کرتے ہیں اور ستم ظریفی حالات پر احتجاج اور تبصرہ بھی کرتے ہیں لیکن کسی مقام پر فن کارانہ حسن اور نفاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی تضحیک میں رکاکت و ابتذال کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ ان کا اندازِ فکر بلند اور سلیقۂ فکر شائستہ اور مہذّب ہے۔ یہ شائستگی اور تہذیب شخصیّت ہی کے تصرّفات ہیں۔

اس خصوص میں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ فن کار کی شخصیّت میں آبرومندانہ خصوصیات بڑی محنت اور جاں کاہی سے تربیت پاتی ہیں۔ طنز و مزاح کا فن ایک نازک فن ہے۔ اس فن کی بہتر خصوصیات کے حصول میں مشاہدہ کی وسعت، تخیّل کی بلندی، فکر کی ندرت اور زبان پر قدرت ضروری شرطیں ہیں جن کو پورا کیے بغیر طنز و مزاح کی ہفت خواں طے نہیں ہو سکتیں۔ غالب نے اچھے فن کار ہونے کی

تمام شرطیں حسن کارانہ اعتدال و توازن کے ساتھ پوری کیں اور اس ہفت خواں کو سر کیا جس میں اکثر فن کار سراسیمہ و سرگرداں پھرتے رہے۔ غالب نے اپنی نفسیاتی ژرف بینی اور طرزِ فکر کے جوہر یوں تو ہر صنفِ نثر و نظم میں عیاں کیے ہیں لیکن ظرافت، مزاح و طنز میں ان کے تخیّل کی جولانیاں حدِّ وسع سے باہر ہیں۔ ان کے مزاح میں ایک طرف ذوق و وجدان کی تسکین کا سامان ہے تو دوسری طرف زندگی کے عام بے تکے پن پر غور کرنے کی ترغیب اور دعوت ہے۔ ان کے چٹکلے اور لطیفے زبان کے حسن کارانہ استعمال کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور جدّتِ فکر و نظر کی جانب راہ نمائی بھی۔ اسی وجہ سے ان کی شخصیّت اربابِ طنز و مزاح میں منفرد مقام کی حامل ہے۔

میرزا صاحب سے پہلے اردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کا معیار وقیع اور خوش کن نہیں ہے۔ اس کا سبب خواہ سیاسی عدم استحکام ہو یا تمدّنی انتشار، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ سوؔدا سے قبل ہزل گوئی اور ہجو گوئی واحد ذریعہ ظرافت تھی۔ اس عہد کے شاعروں میں بھی کم رتبہ ہزلیات اور ہجویات ہنسی پیدا کرنے کے لیے کافی خیال کی جاتی تھیں۔ سوؔدا نے اپنی رنگین بیانی اور شوخیِ فکر سے ظرافت کو ایک درجہ آگے بڑھایا لیکن ان کے مزاج میں ہیجان اور طبیعت میں جھلّاہٹ کا مادّہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کے طنز میں نفرت کا گماں ہونے لگتا ہے۔ اس فنی نقص کے باوجود سوؔدا کے طنز میں بعض آفاقی پہلوؤں کی موجودگی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مرزا نے شوخ نگاری اور بذلہ سنجی کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ انھوں نے اپنی چونچال طبیعت اور شگفتہ مزاجی کا اظہار نظم و

نثر دونوں اصناف میں کیا ہے۔ دونوں اصناف میں ان کی شوخیِ فکر معیاری اور منفرد نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ سودا کی طرح مغلوب الغضب نہیں تھے۔ ان کے مزاج میں ہیجان اور پراگندگی نام کو نہ تھی۔ انھوں نے ظرافت کو مذمّت اور ہجو کے لیے استعمال نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ انھوں نے زندگی کی ناہمواریوں کو ایک مبصّر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے مضحک پہلوؤں پر تعمیری تنقید کی، اور طنز و مزاح سے حالات کی اصلاح پر غور کرنے کا کام لیا۔

نیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم

غالب نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شوخ نگاری اور بذلہ سنجی کا ہدف بنایا ہے۔ اپنی مختصر "اوقات" خدا کی وسیع و عریض کائنات، اس کے بندوں کی محتاجی، اہلِ کرم کا تماشا، جنّت کا تصوّر اور کتنی ہی بے تکی باتیں ان کی تضحیک کا موضوع بنے ہیں۔ لیکن ان کا مزاح کہیں بھی عامیانہ نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی گیرائی اور گہرائی ہے جو قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔ چند مثالیں بغیر کسی خاص تلاش و جستجو کے پیش کی جاتی ہیں :

"یوسف میرزا خاں کو دُعا پہنچے۔ حال قصیدہ مخمّس کا معلوم ہوا۔ قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں جو آبا اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ ان کو منظور ہے دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں :

کارساز ما بہ فکر کار ما

لیکن میری جان، انصاف تو کرو ان ضلعوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بے ہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سالِ آئندہ کے، اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر، نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطرہ، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ کپڑا خریدنا پڑے، نہ گوشت گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور سراسر سرور۔" ؎

"حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج، جے پور پڑے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیا ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر، مداری کے جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی، تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے، وہ بقدرِ سدِ رمق ہے۔"

---

؎ - بنام حسین میرزا، خطوط غالب از مہر۔ ص ۳۹۵

محنت وہ ہے کہ دن رات میں کام سے فرصت کم ہوتی ہے۔
ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت
نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟" [1]

"پرسوں میرزا آغا جان صاحب آئے تھے۔ وہ کہتے تھے
کہ بھاڑا سنگھ اور کاشی ناتھ آئے ہوئے ہیں۔ میں نے
کہا کہ وہ نہ میرے کام کے نہ تمھارے کام کے۔ کام کریں کیا؟
گنجایش ہی نہیں اور جو کچھ ہوتا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ
جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، ابر آیا، مینھ برسا یعنی
سعی کو، تدبیر کو، خواہش کو دخل نہیں۔" [2]

"کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے
کیا جس کو اتار پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ
جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی، رنج و
آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت
گزرنے دو۔"

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز [3]

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو

---

[1] ۔ بنام یوسف میرزا ۔ خطوطِ غالب از مہر۔ ص ۴۰۳

[2] ۔ بنام حسین میرزا ۔ خطوطِ غالب از مہر۔ ص ۳۸۷

[3] ۔ بنام ہرگوپال تفتہ۔ خطوطِ غالب ص ۲۰۶

چکے ۔ رہائی پا چکے ۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں ۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون؟" عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا۔ "حافظ ممّو کون؟" عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، ممّو ممّو مشہور ہوں۔ فرمایا۔ "یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممّو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم، ہم مکان کس کو دیں؟" [1]

"ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھّی بنو، شہد کی مکھّی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چُنّا جان" نہ سہی "مُنّا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامتِ جاودانی ہے اور

---

[1] بنام یوسف میرزا ۔ خطوطِ غالب ۔ ص ۳۹۷

اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصوّر سے
جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حورا جیرن ہو
جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمرّدیں کاخ
اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشمِ بد دور وہی ایک حور۔" [1]
ان مثالوں سے میرزا کی شوخیِ افکار کی ایک واضح صورت سامنے
آتی ہے۔ اس میں پھکڑّپن، پھبتی اور ضلع جگت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔
میرزا کا قہقہہ بے معنی اور تبسّم نفرت انگیز نہیں ہے۔ ان کی تضحیک میں
انسانیت کے دردوالم کے جذبات، تعمیری اشارے اور ہمدردانہ لب ولہجہ
ہے یہی جذبہ "فاتحِ عالم" اور کشورگیر ہے:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

---

[1] بنام میرزا حاتم علی مہر خطوطِ غالب ص ۲۲۹۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دراں پاک مے خانہ بے خروش
چہ گنجایشِ لذّتِ ناؤ نوش
سیہ مستیِ ابرِ باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منّت نہد ناشناسا نگار
چہ لذّت دہد وصل بے انتظار

# بازگشت

گزشتہ ابواب میں میرزا کی شخصیت و کردار کے جن گوشوں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں ان کے مجموعی اثر کا جائزہ مقصود ہے تاکہ مرزا صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کی سماجی اور تہذیبی حیثیت متعین کی جا سکے۔

یہ امر مسلّماتِ متعارفہ سے ہے کہ ہر شخص کی شخصیت کے عناصر (خواہ وہ ادبی ہوں یا غیر ادبی) دو حیثیتوں سے اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پہلا اثر ذاتی اور نجی زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ داخلی کیفیات، ذہنی افتاد اور انفرادی طرزِ فکر اسی اثر کے نتائج ہوتے ہیں۔ دوسرا اثر اس کے سماجی تعلّقات اور اجتماعی رشتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ سماجی اور تہذیبی زندگی میں یہی دونوں اثر فرد کی شخصیت اور کردار کی پیمایش کی اساس بنتے ہیں۔ یہ نظریہ فلسفۂ تمدّن کے بنیادی اصولوں کو مدِّ نظر رکھ کر قائم کیا گیا ہے۔ علمائے نفسیات نے اسی نظریے سے ملتا جلتا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے ذہن کی ترقّی کے دو سبب ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی اور پھر ان میں ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ داخلی سبب میں خود انسان کی ذاتی استعداد اور موروثی قابلیت شامل ہے۔ خارجی سبب میں وہ طبیعی اسباب شامل ہیں جو پیدائش کے وقت سے نشو و نما کے عہد

تک فرد کو گھیرے ہوئے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ نظامِ معاشرت کی تاثیر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چار عناصر انسان کی سیرت کے اجزائے لاینفک ہیں۔

یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں اور ان سے جو اصول مستنبط کیا جائے گا اس کا لب لباب یہ ہے کہ شخصیت کی پیمائش کا قابلِ اعتماد معیار صرف یہ ہو سکتا ہے کہ فرد کا رویّہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ اسی بنیاد پر شخصیت کے حسن و قبح کے متعلق قطعی حکم لگایا جاسکتا ہے، اور سماجی زندگی میں اس کے مقام کا تعین ہو سکتا ہے۔ اس معیار کے علاوہ تمام پیمانے قابلِ اعتماد خیال نہیں کیے جاسکتے۔

اس مقام پر اس نقطۂ نظر کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ پیمائش شخصیت کے مذکورہ اصول کو کسی شخصیت پر منطبق کرتے وقت اسے میکانکی بننے سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ اس لیے کہ شخصیت کی پیمائش اور تحقیق مرکّب بے جان اشیا کی سائنسی تحقیق سے قطعی مختلف عمل ہے۔ مرکّب بے جان اشیا کی سائنسی تحقیق کے نتائج ہر حال میں یکساں رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے انسانی ذات صعود و ہبوط کی بہت سی منزلوں سے گزرتی ہے اور ہر منزل مختلف شخصیتوں پر مختلف انداز میں اثر ڈالتی ہے۔ اس لیے نقّاد اور محقّق کو تجزیہ و تحلیل کے عمل میں محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے عمل کے بہترین نتائج سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

ان مبادیات اور اصولوں کی روشنی میں ہم غالب کی شخصیت اور

کردار کے مجموعی اثر کا جائزہ لیتے ہیں :

غالب جس خاندان میں پیدا ہوئے اور جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اس کے نقوش ان کے ذہن پر اس شدت سے مرتسم ہوئے ہیں کہ وہ ان یادوں اور اثر کو پوری زندگی فراموش نہیں کرسکے۔ ان کے خاندان کی عسکری روایات اور خصوصیات نے ان کی انانیت اور انفرادیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے جن سے قطع نظر کر کے ان کے انفرادی مزاج اور طرزِ فکر کا مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ غالب کی بے پناہ انانیت کے اظہار میں ان کے احساسِ حسب و نسب کا بڑا دخل ہے۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اس وجاہت سے متعلق روایات کو خلوت و جلوت میں اپنے پیشِ نظر رکھتے تھے۔ مہر نیم روز میں جو آلِ تیمور کی مختصر تاریخ ہے۔ ان کے اس احساس کا اظہار بار بار ہوتا ہے۔ بلکہ مہر نیم روز کے مطالعہ سے بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ان کی مشہور غزل تجمل حسین خاں کی مدح کا بہانہ تھی۔ مہر نیم روز ان کی انانیت اور انفرادی طرز کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ "خطاب زمین بوس" کے عنوان سے جو سطریں انھوں نے سپردِ قلم کی ہیں وہ ان کی شخصیت اور مزاج کی پوری نمایندگی کرتی ہیں۔

"روئے آوردنِ من از عدم بوجود، بسودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود۔ کالائے بیش بہائے من دریں چارسو روئے روائی نہ دید و شاخِ گراں مایۂ مرادریں بازار ارزش ارزانی نہ شد۔ ناچار ہرچہ با خویشتن آوردہ ام چوں گویم کہ با خویشتن می برم۔ لختے در سفینہ ہا و پارۂ در سینہ ہا می گذارم و می گزرم۔ پس از من آں گنج شایگاں را ہمہ یاد ببرد، گو ببر واگر ہمہ خاک

بخورد، گو بخور۔ بسینہ آرزو ہائے جواں میرا مدفن است۔ لمعۂ نگاہِ گرم چراغِ گورِ غریباں باد۔ آباء و نیاگانِ نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند و فرماں دہاں با فر و فرہنگ۔ فرد مردنِ چراغِ ہستیِ نور دیدۂ تور، بہ بادِ آستین کینۂ کیخسرو، پشنگیاں را روزِ سیاہ پیش آورد۔ خداوندانِ اورنگ و دیہیم را ازاں برگ و سازہا جز تیغِ کُند تا گوں بکف نماند۔ بہ مرز و بوم بیگانہ روئے آوردند۔ و بدستِ مردِ تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں نیستاں ایواناں، کہسار نشیمن، سلجوقیاں دگر بارہ سر بہ افسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ جناں کہ خوئے اوست، ایں نامدارانِ کاؤس کوس را نیز افگند۔ نظم:

در مشربِ ما خواہشِ فردوس نہ جوئی
در مجمعِ ما طالعِ مسعود نہ یابی
در بادۂ اندیشۂ ما درد نہ بینی
در آتشِ ہنگامۂ ما دود نہ یابی

از واپسیانِ ایں قافلہ نیائے من کہ در قلمروِ ماوراء النہر سمرقندی شہر مسقط الراسِ وے بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد۔ در دفترِ سپہر بہ شاہ نشان ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیعِ نوکریِ شاہہش نوشتند و بر پرگنہ پہاسو براتِ روزیِ وے و سپاہش نوشتند۔ پدرم پیشۂ پدر زخویش داشت و ہم در کارزار جامہ گذاشت ہمانا گلبن نشائے ترانو آئیں نوا بلبلے ہمی بایست کہ مرا زمزمہ سنج دوستاں

سرائے آفرید ند"[۱]

ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں :

"اگر چناں کہ بہ دورانِ توام، بروزگارِ فرزانہ جمشید بودمے، جمشید روزگار را آفریں گفتے۔ و اگر بداں ساں کہ ثناخوانِ شہر یارم فرخ فریدوں راستودمے، فریدوں چرخ وستارہ را گرد سر گشتے۔ دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت وژند آورد، اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے، آذر از بیم زبانہ نزدے واز دلِ فریبیِ بیانِ من کس بہ شنیدنِ ژند نہ پرداختے۔ من بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوند کار فرمائے دارم ہر قدر بر خویشتن بنازم۔ جا دارد سرت گردم۔ تو نیز بدیں ہنگامہ بناز کہ ہمچو غالب بندۂ آتش نوائے داری۔ اگر بہ اندازۂ سہرداد التفات می دہی جائے مردمکِ دیدۂ من باز گزار ودیدۂ دل بروئے من بکشائے۔ گویند در عہدِ جہاں بانیِ حضرت صاحب قرانِ ثانی، بفرمانِ آں خسروِ دریادل کلیم را صد بدہ بہ سیم و زر و لعل و گوہر سفتہ اللہ۔ من آں خواہم کہ دیدہ وراں را دستورے دہی تا از کشش بر بخت و یکبار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند۔"[۲]

اس سلسلے کے چند جملے اور پیش کیے جاتے ہیں :

"پریشاں نوائی من در ستایشِ خویش اگر خود گزاف

---

[۱]۔ مہرِ نیم روز۔ ص ۱۳۔ مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور۔

[۲]۔ مہرِ نیم روز۔ صہ ۱۵، صہ ۱۶

نباشد گفتارِ راست، بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نہ باشد۔
آخر نہ ہمانم کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردمے و ہیچ گاہ برخود
گمانِ کمال نہ بردمے سرمستیِ ذوق برگزیدنِ ایں والا نظر کہ
برگزیدۂ تست مرا از من برد۔ خامہٗ بے پروا پوئے را بدیں روش و
آہنگ بہ خرامش و رامش آورد۔" [1]

یہ طویل اقتباسات غالب کی شخصیت وکردار کے بعض عیاں اور نہاں گوشوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان اقتباسات سے غالب کے عہد کے طبقاتی نظام کا دھندلا سا خاکہ بھی ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود غالب کے ذہن میں اس طبقاتی نظام نے تہذیب کا جو تصوّر پیدا کیا تھا اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ غالب کے عہد کے طبقاتی نظام اور اس طبقاتی نظام کے تہذیبی اثرات سے متعلق بحث آگے آئے گی۔ اس وقت مہر نیم روز کی پیش کردہ عبارتوں کی روشنی میں غالب کی ذہنی اور فکری زندگی کے اہم گوشوں تک پہنچنا مقصود ہے۔

مہر نیم روز کی پیش کردہ عبارتوں میں ان حضرات کے لیے جو علم النفس کے اصولوں کو نقد و تبصرہ کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ تفریحِ طبع کا بہت سا سامان موجود ہے اور اس سے قبل بعض بزرگوں نے غالب کی اسی انداز کی تحریروں اور اشعار کو اپنی تنقید کا ہدف بھی بنایا ہے۔ لاشعور کے مبہم اندازوں کو بنیاد بناتے ہوئے غالب کے ہاں احساسِ کمتری کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ انھیں نرگسیت کے مرض میں مبتلا بھی دیکھا گیا ہے۔

---

[1] ۔ مہر نیم روز۔ ص ۱۶

لیکن اس طرح کے یک طرفہ فیصلے غالب کے شعور کی واضح صورتوں سے اغماض کر کے کیے گئے ہیں اور ہر چند کہ نفسیاتی تنقید کے بعض اصول قابلِ عمل اور لائقِ ستائش ہیں لیکن اس باب میں قیاس و گمان کو راہ نما بنا کر غالب کے مزاج کا جو مطالعہ کیا گیا ہے وہ یقیناً نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔

غالب کی نفسیات کا تجزیہ کرنے والوں نے غالباً اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ فن کار لاشعور کی پیچ در پیچ گزرگاہوں میں اتنا محصور نہیں ہوتا جتنا کہ اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ وہ اپنے فن اور شخصیت کی تکمیل میں اپنے شعور سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے اور لاشعور کے طلسم کو اپنی شعوری کوششوں سے توڑ دیتا ہے۔ اس لیے تنقیدی عمل میں فن کار کے شعور کی اوّلیت اور اہمیّت کو لاشعور سے مستنبط کیے ہوئے مبہم فیصلوں پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کے ہاں انانیت اور عرفانِ ذات کا اظہار لاشعور کے وسیلے سے احساسِ کمتری کی بنا پر نہیں ہوا ہے بلکہ اس احساس کے اظہار میں ان کے خاندانی حالات، ان کے طبقے کا ماحول، اور تہذیبی روایات کے تمام عوامل شعوری طور پر کارفرما ہیں۔ غالب جو اپنے دور کی بے پناہ سپردگی سے آزاد ہیں، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا انفرادی طرزِ فکر ذہنی افتاد اور شخصی مزاج ان کے شعور سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اگر بدلتے ہوئے سماج میں انفرادی زندگی کے رویّے کو متعیّن کرنے میں انفرادیت اور انانیت کا اظہار کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے تو بلاشبہ ہمارے ادب میں غالب کی تہذیبی اور سماجی

حیثیت کو کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے اور واقعی ایسا نہیں ہے تو غالب کی تہذیبی اور سماجی حیثیت جہاں تک کہ انفرادی زندگی کا تعلّق ہے، بہت سے درجات رکھتی ہے جنھیں آپ کوئی بھی نام دے سکتے ہیں:

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

غالب کی تخلیقات میں محض شخص کا تصوّر ہی عظیم نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی عملی طور پر انفرادی زندگی میں عظیم تھے۔ اپنی زندگی کی بقا و بہبود کے لیے ان کی تگ و دو، نامساعد حالات میں ناقابلِ شکست عزم و حوصلے کا اظہار، آرزوؤں اور تمنّاؤں کی تخلیق، پوری نہ ہونے والی امیدوں کا غم، ان کی رجائیت و انفرادیت یہ تمام خصائص ان کی عظمت کے لیے کافی دلیل ہیں اور ان خصائص کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بہ حیثیت فرد ان کا تہذیبی اور سماجی مقام آسانی سے متعیّن کیا جا سکتا ہے:

عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ

چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

غالب کے اجتماعی تصوّرِ زندگی کو متعیّن کرنے کے لیے ان کے عہد کے تمدّنی نظام اور اس کے بنیادی عناصر کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس مقام پر ہم اس نظام کا تاریخی پس منظر استنباطِ نتائج کی غرض سے پیش کرتے ہیں:

ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہونے کے بعد اس ملک کا سماج چار نمایندہ طبقوں میں منقسم نظر آتا ہے۔ طبقۂ اوّل میں سلاطین اور امرائے دربار شامل ہیں جنھیں ہم اپنی آسانی کے لیے جاگیردار

طبقہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ طبقہ ہر حال میں سلطانِ وقت کا وفادار تھا اور اپنی
خدمات کے صلے میں دربار سے منصب، مراتب اور جاگیرات حاصل کرتا
تھا۔ دولت کی فراوانی نے اس طبقے کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں، دونوں سے
بے نیاز کر دیا تھا۔ دوسرا طبقہ سلاطین اور امرائے دربار کے متوسّلین کا
تھا جن کے معاشرتی مفادات طبقۂ اوّل کی توجّہ اور سرپرستی پر منحصر
تھے۔ اس طبقے میں علما، شاعر، دانش ور، اہلِ سیف اور دوسرے اہلِ
کمال شامل تھے۔ تیسرا طبقہ عام دست کاروں اور اہلِ حرفہ کا تھا۔ یہ
لوگ اپنی معیشت کے باب میں بڑی حد تک طبقۂ اوّل اور دوم کی
عنایات کے محتاج تھے۔ چوتھا طبقہ کسانوں اور کاشت کاروں کا تھا۔
جن کی حالت جاگیر کے بہت کم صلہ پانے والے مزدور کی تھی۔

یہ تمدّنی نظام افغان سلاطینِ دہلی کے زوال کے بعد آلِ تیمور کو ورثہ
میں ملا اور معمولی تغیّرات کے ساتھ ان کے عہدِ حکومت میں بدستور
قائم رہا۔ یہ تغیّرات مغلوں کے دربار میں راجپوت والیانِ ریاست
اور ایرانی سرداروں کی جو کثرت نظر آتی ہے اس کا سبب مغلوں کی سیاسی
اور مذہبی حکمتِ عملی میں مضمر ہے۔ اس نئی حکمتِ عملی نے ہندوستان
کی تاریخ میں جو انقلابات اور تغیّرات رونما کیے وہ ہمارے موضوع
سے خارج ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف یہ حقیقت ہے کہ طبقاتی نظام
کا جو ہیولا افغان سلاطینِ دہلی کے آخری عہد میں متشکّل ہوا، قریب
قریب وہی مغلوں کے عہدِ حکومت میں برقرار رہا۔ بادشاہ زمین پر
اللہ کا سایہ تھے اور ارکانِ دولت صاحبانِ امر فضل و کمال رکھنے والے
ہوق کی عبادت کرتے تھے اور حاصل کا افسوس باقی رہے زمین کا سینہ

پھیر کر پیداوار میں اضافہ کرنے والے، سو ان کی تعمیر میں خرابی کی صورت پنہاں تھی۔

یہ تھا ہندوستان کا وہ تمدنی نظام جسے سات سمندر پار کے سوداگروں نے ہندوستان میں سیاسی برتری حاصل کرنے کے بعد رو بہ عمل پایا۔ ان سوداگروں کو جو آہستہ آہستہ پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ اس نظام کے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تبدیلی کی یہ ضرورت ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کی بنا پر نہ تھی بلکہ پوری دنیا ایک نئے نظام کی طلب گار تھی۔ یہ انسانوں کی تمدنی تاریخ کی ایک ضرورت تھی جسے بہر صورت پورا ہونا تھا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں بھی سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے ابتدائی خط و خال مکمل کر لیے اور ایک طرح کا نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام متشکل ہو گیا۔ غیر ملکی حکمران جو سوداگروں کے روپ میں استعمار و استبداد کے پیکر تھے نہ جاگیردار طبقے کے بہی خواہ تھے اور نہ عام رعایا کے۔ ان کے پیشِ نظر صرف ایک مقصد تھا کہ وہ ہندوستان کی دولت سے لندن کے باغ و راغ آراستہ کریں اور اپنے ملک کی سفید فام آبادی کے معیارِ زندگی کو ترقی دیں۔ اپنے صنعتی کارخانوں کو خام مال مہیا کریں اور اپنی سرمایہ دارانہ قوت کے بل پر غیر ترقی یافتہ اقوام کو مطیع بنائے رہیں۔ انگریزوں کی اس حکمتِ عملی نے ہندوستان میں دو مزید طبقوں کے پیدا کرنے کی گنجائش نکال لی۔ جن میں سے ایک طبقہ سرمایہ داروں کا تھا۔ جو نئی نئی صنعتوں کو قائم کر رہا تھا۔ اور دوسرا طبقہ ان متوسط درجے کے لوگوں کا جن کا مفاد اقتدار رکھنے والی غیر ملکی قوم اور سرمایہ داروں سے وابستہ تھا۔ یہ متوسط طبقہ اگرچہ

مالی اعتبار سے زیادہ خوش حال نہ تھا تاہم اپنے روابط کی بنا پر طبقۂ خواص میں شمار کیا جاتا تھا۔ اگر عہدِ مغلیہ کے طبقاتی نظام کو پیشِ نظر رکھ کر نئے نظام کی طبقاتی تقسیم کی جائے تو اس طرح ہو گی:

۱۔ والیانِ ریاست اور جاگیردار
۲۔ صنعتی کارخانوں کے مالک سرمایہ دار
۳۔ برسرِ اقتدار حکومت اور جاگیرداروں کے متوسّلین
۴۔ دست کار اور اہلِ حرفہ
۵۔ کسان اور مزدور

غالب اس طبقاتی نظام کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو حکومت اور جاگیرداروں کا وظیفہ خوار کہلاتا تھا۔ اس طبقے کے حالات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے روابط ہر اس شخص اور جماعت سے قائم رکھے جس سے کار برآری کی تھوڑی سی بھی امید ہو۔ اس لحاظ سے اس طبقے کے معاشرتی روابط کی ایک سمت ایوانِ حکومت تک جاتی تھی تو دوسری سمت کارپردازانِ حکومت سے بچی تعلقات پر ختم ہوتی تھی۔ اپنے حلقۂ اثر کی کشادگی اور وسعت کی بنا پر اس طبقے کے افراد دوسرے طبقوں کے افراد سے نسبتاً زیادہ سماجی سوجھ بوجھ رکھتے تھے لیکن یہ سماجی شعور ایک خاص سطح سے آگے نہ بڑھا تھا۔ سماج کے طبقوں میں جو باہمی ربط ہوتا ہے اور جو مشترک سماجی ضرورتیں انھیں ایک دوسرے سے قریب تر لاتی ہیں اور سماجی ارتقا ہر شعبۂ زندگی میں جس طرح درجات طے کرتا ہے اس تمام عمل سے اس طبقے کے افراد بیگانۂ محض تھے۔ غالب اسی طبقے کے ایک فرد تھے۔ ان کے سماجی شعور اور اجتماعی تصوّرِ زندگی کو ان کے اپنے طبقے کے سماجی شعور

اور اجتماعی تعلقات کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔

غالب انگریزوں کے وظیفہ یاب تھے۔ ان کے مداح تھے۔ انگریزی سرکار میں ان کا ایک منصب متعین تھا۔ وہ اپنے عہد کے رئیس زادوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا ننھیال اکبرآباد کے خوش حال اور متموّل خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحب زادی امراؤ بیگم سے عقد کے بعد دہلی کے طبقۂ خواص سے عموماً اور خاندانِ لوہارو سے خصوصاً ان کے مراسم قریب تر ہو گئے تھے۔ آخری بزم نشینانِ دہلی سے ان کے ذاتی اور نجی تعلقات تھے۔ بادشاہ اور شہزادوں کی استادی کا فخر انھیں حاصل تھا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ تمام رابطے اور رشتے غالب ہی سے مخصوص نہ تھے بلکہ ان کے طبقے کا ہر فرد کسی نہ کسی حیثیت سے ان خصوصیات سے بہرہ یاب تھا۔ بااین ہمہ غالب کا اجتماعی شعور اپنے طبقے کے افراد سے نہ صرف مختلف بلکہ بڑی حد تک ترقی یافتہ تھا۔ ان کے اجتماعی شعور کے ترقی یافتہ ہونے کے بعض اسباب ہیں جن میں پہلا اور غالب سبب یہ ہے کہ ان کا ذہن تجسس خیز اور طبیعت تجزیہ پسند تھی۔

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ ہر عظیم شاعر، ادیب اور فن کار فطری طور پر ذہین اور طبّاع ہوتا ہے یہی ذہانت اور طبّاعی اسے لکیر کا فقیر ہونے سے محفوظ رکھتی ہے اور اس کی احساس کی دنیا میں مستقبل کے امکانات روشن کرتی ہے۔ عظیم فن کار اپنی دنیا میں رہتے ہوئے ان جانی دنیا کی تخلیق کرتا ہے یا اُس کی تخلیق کے امکانات واضح کرتا ہے۔ اس کی تخلیقات محض تصوّرات اور رومانیت پر ہی مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ان

یں فن کار کا شعور اور فکر بھی شامل ہوتا ہے، وہ شعور جو وہ اپنے سماج سے حاصل کرتا ہے اسے اپنا بنا لیتا ہے اور پھر اس میں انفرادی رنگ بھرتا ہے۔

بلاشبہ غالب کسی نئے جہان کے خالق نہیں تھے۔ ان کی شاعری جزوِ پیغمبری بھی نہیں ہے۔ وہ کسی باضابطہ نظامِ فلسفہ کے بانی بھی نہیں ہیں۔ ان سے جاگیردار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور، سرمایہ و محنت کی شاعری کی توقع بھی عبث ہے اس کے باوجود یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کا تہذیبی مزاج رجعت پسند نہ تھا وہ مغلیہ تہذیب و تمدّن کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ یہ قومی احساس بھی رکھتے تھے کہ مغلیہ تہذیب کے افسانے حقیقت نہیں بن سکتے۔ اس لیے انھیں جدید عہد کے تمدّنی تقاضوں سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ جو ہم ان کو آخری عمر میں ضعیفی اور معذوری کے باوصف سوسائٹی کے جلسوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کی بنیاد میں اقتضائے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا وہ تصوّر ہے جو سماجی زندگی پر غور و فکر کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے:

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن
جوئے بہ خیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو

غالب کی زندگی میں بعض اور مواقع بھی آئے ہیں جب انھیں بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں کا احساس ہوا ہے اور جس کا انھوں نے بے باکی سے اظہار کیا ہے۔ آئینِ اکبری کی تصحیح کے موقعے پر انھوں نے سر سیّد احمد خاں کو جو اشعار لکھ کر بھیجے۔ ان میں ان کے ذہن

کے ترقی پسند میلانات پوری طرح اجاگر ہوتے ہیں :

این که در تصحیحِ آئیں رائے اوست
ننگ و عارِ ہمتِ والائے اوست
بر چنیں کارے کہ اصلش این بود
آں ستایدِ کش دریا آئیں بود
گر بدیں کارش نگویم آفریں
جائے آں دارد کہ بدہم آفریں
کس مخر باشد بہ گیتی این متاع
خواجہ را چہ بود امید انتفاع
گر ز آئیں می رود با ما سخن
چشم بکشا دندریں دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر
شیوہ و اندازِ ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آں چہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
زیں ہنر مینداں ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق این قوم است آئیں داشتن
کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتشے کز سنگ بیروں آورند
ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تاچہ افسوں خواندہ اند ایشاں برآب
دود کشتی را ہمی راند درآب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد
گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
از دخاں زورق برفتار آمدہ
باد و موج ، ایں ہر دو بے کار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ
رو بہ لنڈن کاندراں رخشندہ باغ
صبح روشن گشتہ در شب بے چراغ
کار و بارِ مردمِ ہشیار بیں
در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں
پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
ہو چنیں گنج گہر بیند کسے
خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست[1]

ان اشعار کے مطالعے سے بعض حقائق سامنے آتے ہیں جن کی مدد سے غالب کے اجتماعی تصورِ زندگی اور شعورِ زندگی کو متعین کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غالب اپنے عہد کے انگریزی نظام کو عہدِ اکبری کے دستوری نظام سے بہتر خیال کرتے تھے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر حقیقت پرستی پر مبنی تھا آج

---

[1] ۔ ان اشعار کے سلسلے میں غالب پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ دونوں اعتراضات کا تعلق ان کی شخصیت اور کردار سے ہے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ سرسید کے باب میں غالب نے اپنی وضع داری کا کوئی لحاظ نہیں رکھا اور ان قدیم مراسم کو یکسر نظر انداز کر دیا جو اُن میں اور سرسید میں قائم تھے آئینِ اکبری کی تصحیح پر تقریظ لکھنے کی بجائے نکتہ چینی کا شیوہ اختیار کیا اور یہ غالب جیسے وسیع مشرب اور دوست نواز انساں کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ اعتراض بظاہر بہت اہم اور جان دار معلوم ہوتا ہے لیکن اصل مسئلے پر ذرا سے غور کے بعد غالب کے حق بجانب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ تقریظ یا تحسین کے کلمات دراصل اس تصنیف یا تالیف کے بارے میں لکھے اور کہے جاتے ہیں جس کے موضوع پر مصنف یا مولف اور تقریظ لکھنے والے میں اتحادِ خیال ہو۔ اگر موضوع پر جانبین میں کوئی اتحادِ خیال نہ ہو تو تقریظ لکھنے یا تحسین کے کلمات کہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ غالب کو چوں کہ اصل موضوع ہی سے اختلافِ نظر تھا لہٰذا انھوں نے تقریظ لکھنے کی بجائے اصل موضوع سے اپنے خیالات ظاہر کر دیے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ایک سے زیادہ صدی گزر جانے پر سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اپنی تمام
بدنمائیوں کے ساتھ ابھر آئی ہیں لیکن غالب کے عہد میں سرمایہ دارانہ نظام
وقت کا اہم تقاضا تھا اور بہر صورت جاگیردارانہ نظام سے بہتر اور ترقی پزیر
تھا۔ اس نظام نے جاگیردارانہ نظام کے مقابلے میں معاشرت میں بہت سی
خوبیوں کو عام کیا اور عوام کے لیے اس میں افادیت کے بہت سے پہلو
تھے۔ یہ بحث دوسری ہے کہ ہر نظام اپنی عمر ختم کرنے کے بعد برائیوں کی

---

یہ اظہارِ خیال ان کی راست گوئی اور درست طریقۂ کار پر دلیل ہے کہ انھوں
نے اس باب میں منافقت کی راہ اختیار نہیں کی اور اپنی شخصیت و کردار
کے اصل رخ کو پیش کر دیا۔ یہ رخ ایک حقیقت طلب نقّاد کی نظر میں ہرگز
بدنما نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض ان اشعار کے سلسلے میں یہ ہے کہ ان میں
انگریزوں کی بے جا خوشامد کی گئی ہے کیوں کہ غالب مطلب برآری کے وقت
ایسا کرنے کے عادی تھے۔ یہ اعتراض بھی اسی وقت حق بجانب قرار دیا
جا سکتا ہے جب خوشامد اور صداقت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے۔
حقیقت یہ ہے کہ خوشامد صداقت سے بالکل معرّا ہوتی ہے اور اسی
لیے وہ خوشامد کہلاتی ہے کہ اس کا صداقت سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔
لیکن قول یا تعریف میں صداقت کے تمام عناصر پائے جائیں تو وہ خوشامد
کے ذیل میں نہیں آتے بلکہ صحیح تعریف کے ضمن میں آتے ہیں۔ غالب نے
اپنے اشعار میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ زندہ حقائق تھے اس لیے ان باتوں
کو خوشامد اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب حق و انصاف کے تمام اصولوں
کو خیر باد کہہ دیا جائے۔

آماج گاہ بن جاتا ہے۔ بہر حال غالب نے یوتاریخی جبریت کے قانون سے لاعلم تھے اس نظام کو پسند کیا اور اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ اطمینان ان کے جماعتی تصوّرِ زندگی کے ترقی پزیر پہلو کو پیش کرتا ہے۔

۲۔ غالب کو ایک نئے عہد کی تشکیل کا پورا پورا احساس تھا اور وہ جدید عہد کے مضمرات کو قابلِ قدر جانتے تھے۔ ان کے خیال میں مردہ پروری مبارک کام نہ تھا۔ وہ مستقبل کی جانب نظر رکھتے ہیں اور یہ اندازِ نظر ان کی بالیدگیِ طبع پر دلیل ہے اور ان کے سماجی مزاج کا ترجمان ہے۔

۳۔ غالب جدید ایجادات کی افادیت کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے، اور انھیں یہ نئی ایجادات وحشت زدہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ خوش ہوتے تھے کہ زمانے نے تہذیب کی جانب پیش قدمی کی ہے۔

اس تجزیہ کی بنا پر آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے اجتماعی تصوّرِ زندگی اور اجتماعی شعورِ زندگی کے میلانات متوازن اور معتدل تھے اور ہمارے ادب میں ان کی سماجی اور تہذیبی حیثیت بڑے بلند مقام پر قائم ہے جہاں سے آج بھی ان کے نغمے ہمارے ذہنوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگرد انیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
بہ گوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بہ کوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ رہگزر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستانانِ شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشانانِ صبح گاہی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

---

دلم بہ سبحہ و سجادہ وردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت است
ببیں ز دور رو مجوف رب شہ کہ منظر را
دریچہ باز و بدر وا نہ از دہا خفت است
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

---

از جسم بہ جاں نقاب تاکے
ایں گنج دریں خراب تاکے
ایں گوہر پُر فروغ یارب
آلودۂ خاک و آب تاکے
ایں راہ رو مسالک قدس
واماندۂ خورد و خواب تاکے

---

# کتابیات


| | | |
|---|---|---|
| اردوئے معلیٰ | غالب | ایم فرمان علی۔ لاہور، سال ندارد |
| یادگار غالب | مولانا حالی | ایم فرمان علی۔ لاہور، سال ندارد |
| محاسن کلام غالب | ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری | انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ، ۱۹۵۸ء |
| مکاتیب غالب | مرتبہ مولوی امتیاز علی عرشی | رام پور، ۱۹۴۳ء |
| دیوان غالب | مرتبہ مولوی امتیاز علی عرشی | انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ، ۱۹۵۸ء |
| غالب نامہ | ڈاکٹر شیخ محمد اکرام | بمبئی۔ طبع چہارم، سال ندارد |
| حکیم فرزانہ | ڈاکٹر شیخ محمد اکرام | فیروز سنز۔ لاہور، ۱۹۵۷ء |
| ارمغان پاک | ڈاکٹر شیخ محمد اکرام | فیروز سنز۔ لاہور، ۱۹۵۹ |
| غالب۔ فکر و فن | ڈاکٹر شوکت سبزواری | انجمن ترقی اردو۔ کراچی، ۱۹۶۱ء |
| غالب | مولانا غلام رسول مہر | لاہور، ۱۹۴۶ء |
| خطوط غالب | مولانا غلام رسول مہر | لاہور، سال ندارد |
| غالب | ڈاکٹر خورشید الاسلام | علی گڑھ، ۱۹۶۰ء |
| ذکر غالب | مالک رام۔ ایم اے | مکتبہ جامعہ دہلی |
| احوال غالب | مرتبہ سید مختار الدین آرزو | علی گڑھ |
| نقد غالب | مرتبہ سید مختار الدین آرزو | علی گڑھ، ۱۹۵۶ء |
| افکار غالب | ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم | مکتبہ معین الادب۔ لاہور، طبع دوم |
| تذکرہ غوثیہ | مولوی گل حسن | لاہور، سال ندارد |
| تحلیل نفسی | حزب اللہ ایم۔ اے | لاہور، ۱۹۴۸ء |
| کلیات نثر غالب | غالب | مطبع نول کشور۔ لکھنؤ |
| مہر نیم روز | غالب | لاہور، ۱۹۲۵ء |
| سہ ماہی نوائے ادب | بمبئی (انڈیا) | جنوری، ۱۹۵۲ء |
| علی گڑھ میگزین شمارہ (۱) | علی گڑھ یونیورسٹی | علی گڑھ، ۱۹۵۹ء |

| | | |
|---|---|---|
| تنقید اور عملی تنقید | پروفیسر احتشام حسین | لکھنؤ، ۱۹۵۲ء |
| روایت اور تجربے | پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | |
| غزل اور متغزلین | پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | |
| ادب اور نظریہ | پروفیسر آل احمد سرور | لکھنؤ، ۱۹۵۴ء |
| دہلی کا دبستان شاعری | نورالحسن ہاشمی | کراچی، ۱۹۶۶ |
| غالب نمبر (جلد اول و دوم) | مرتبہ خواجہ احمد فاروقی | دہلی کالج۔ دہلی، ۱۹۶۱ء |
| علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) | علی گڑھ یونیورسٹی | علی گڑھ، ۴۹۔۱۹۴۸ء |

# مقالات ممتاز

ممتاز دانشور ڈاکٹر ممتاز حسن کے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

شان الحق حقی

اردو ادب، عالمی ادب، تعلیم و ثقافت اور اقبالیات کے موضوع پر چھیالیس مقالات کا مجموعہ۔ اس میں قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، ملک الشعرا بہار اور بعض دیگر اکابر کے شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔

○ صفحات ۴۷۲ ○ قیمت ایک سو پچاس روپے

ادارہ یادگار غالب

دوسری چورنگی۔ ناظم آباد

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

# یادگار غالب

"یادگار غالب" اردو زبان کی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کا شمار اردو کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ غالب شناسی کا نقطہ آغاز بھی یہی ہے۔ یہ غالب پر پہلی جامع کتاب ہی نہیں، غالبیات کے موضوع پر اب تک لکھی گئی سیکڑوں کتابوں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا حالی، شاعری میں غالب کے شاگرد تھے اور ان سے ذاتی تعلقات کی بنا پر، ان کی سوانح عمری لکھنے کے ہر لحاظ سے اہل تھے۔ لیکن یادگار غالب صرف سوانح عمری نہیں ہے، غالب کے اردو فارسی کلام نظم و نثر کا پہلا مبسوط جائزہ بھی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۷ء میں جب غالب کی پیدائش کو پورے سو سال گزر چکے تھے، نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر ایڈیشن، اسی پہلے ایڈیشن کی عکسی بازیافت ہے جو غالب کے دو صد سالہ یوم پیدائش پر شائع کیا گیا ہے۔ گویا یہ "یادگار غالب" کا بھی صدی ایڈیشن ہے۔


○ صفحات ۴۵۶ قیمت دو سو روپے

ادارہ یادگار غالب

دوسری چورنگی۔ ناظم آباد

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

پروفیسر لطیف اللہ ۱۵ر جولائی ۱۹۲۸ء کو الور میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے
ایم اے (اردو) کیا اور درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ ۱۹۸۸ء میں گورنمنٹ کالج کراچی سے
بہ حیثیت استاد ریٹائر ہوئے۔
ان کی دلچسپی کا بنیادی موضوع تصوف ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی کتابیں
ترجمہ کی ہیں اور "تصوف اور سریت" جیسی فکر انگیز کتاب بھی لکھی ہے جو اپنے موضوع پر پہلی
تصنیف ہے اور جسے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ "انفاسِ امدادیہ" کے نام سے
حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی سوانح عمری بھی لکھ چکے ہیں۔
فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب سے اور اس حوالے سے غالب سے پروفیسر لطیف اللہ
کو جو دلچسپی ہے، اس کا اظہار ان کی زیر نظر تصنیف سے ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے غالب کی
شخصیت اور کردار کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ ہمارے سامنے غالب کی اصل تصویر آجاتی ہے۔
بقول حالی، ایک ایسے انسان کی تصویر:
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات